WomenWrit
Classics

افسانے

چوٹیں

عصمت چغتائی

RHOTAS LPS
Low Priced Series

چوٹیں

افسانے

عصمت چغتائی

روہتاس بکس

اشاعت اول	1992ء
پرنٹرز	نفیس پرنٹرز پٹیالہ گراؤنڈ لاہور
پبلشرز	روہتاس بکس احمد چیمبرز - ٹیمپل روڈ لاہور

چوٹیں

ترتیب

جنازے 5

سفر میں 18

پنکچر 24

اس کے خواب 42

بیمار 51

کیوں رے کتے 58

بن بلایا مہمان 65

بچہ 75

بھول بھلیاں 85

بلا خیزی 102

جنازے

میرا سر گھوم رہا تھا------ جی چاہتا تھا کہ کاش ہٹلر آ جائے اور اپنے آتشیں لوگوں سے اس نامراد زمین کا کلیجہ پھاڑ دے۔ جس میں ناپاک انسان لی ہستی بھسم ہو جائے ساری دنیا جیسے مجھے ہی چھیڑنے پر تل گئی ہے میں جو پودا لگاوں مجال ہے کہ اسے مرغیوں کے بیدرد پنجے کریدنے سے چھوڑ دیں۔ میں جو پھول چنوں بھلا کیوں نہ وہ مری سہیلیوں کو بھائے۔ اور وہ کیوں نہ اسے اپنے جوڑے کی زنیت بنا لیں۔

غرض میرے ہر قول و فعل سے دنیا کو بیر ہو گیا ہے اور میری نیا بھی کتنی ہے۔ یہی چند بھولے بھٹکے لوگ۔ دو چار سیکنڈ ہینڈ عاشق مزاج اور کچھ پھوڑ۔ لڑاکا اور فیشن پر مرنے والی سہلیاں------ یہ بھی کوئی دنیا ہے؟ بالکل تھکی ہوئی دنیا۔ میرے تخیلات سے کتنی نیچی اور دو------ اور اب تو اس دنیا میں اور بھی دھول اڑنے لگی۔ معلوم ہوتا ہے قبل از وقت پیدا ہو گئی ہوں۔

تعلق جسے دیا دیوانہ کہتی ہے وہ بھی اپنے وقت سے پہلے آیا تو حواس باختہ ہو گیا پھر میں کیا چیز ہوں------؟ لیکن ایک زمانہ ہو گا۔ جب دنیا میری ہی ہم خیال ہو جائے گی۔ لوگ میری سنیں گے۔ اور کشور------ کشور کے واقعہ نے تو مجھے بالکل نیم مردہ کر دیا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ مری یہ چیخ پکار یہ پھڑکتا ہوا دل جس میں انسانی ہمدردی اور اخوت کا سمندر لہریں مار رہا ہے۔ جس کے خواب ملک کی بہتری کی نذر ہو چکے ہیں۔ جس کے جذبات مذہب اور انسانیت میں غرق ہیں------ یہ سب کچھ بیہ بالکل بے کار------ بیل گاڑی کی چوں چوں اور مریل گھوڑے کی

ناپوں میں بھی تو اس سے زیادہ اثر ہے۔
"یہ بھی کوئی دنیا ہے------ یہ بھی کوئی دنیا ہے------" میں کرسی پر جھوم رہی تھی۔
"کس کی دنیا-----؟ میری-----" راحت اندر آکر تخت پر بیٹھ گئی۔
راحت----- آپ نے چند موم کی پتلیوں کو تو دیکھا ہو گا۔ ننھی منی کھیل کود کی شوقین جن کا مقصد زندگی سے کھیلنا ہے۔ گڑیوں سے کھیلنا کتابوں سے کھیلنا----- اماں ابا سے کھیلنا----- اور پھر عاشقوں کی پوری کی پوری ٹیم سے کبڈی کھیلنا----- ابھی میرے بدنصیب بھائی کے ساتھ ٹینس کھیل کر آ رہی تھی۔
"تمہاری دنیا----- راحت تمہاری دنیا تو ٹینس کے کورٹ پر ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔
"کون...... میری-----؟ تمہارا مطلب ہے ضمیر؟ توبہ کرو۔ وہ تو تمہارا بھائی ہے! پر ہے چغد----- معاف کرنا...... اللہ کی قسم ایسے ہاتھ چلاتا ہے جیسے ٹینس کے بجائے فٹ بال کھیل رہا ہے اور پھر مزہ یہ ہے کہ اگر جناب کے ساتھ نہ کھیلو تو...... یہ کہ...... بس-----"
"یہ میرے بھائی صاحب کی شان میں میرے منہ پر فرمایا جا رہا تھا اگر میں بھی شہنشاہ اکبر کی طرح طاقتور ہوتی تو اس بے ایمان چھوکری کو انار کلی کی طرح دیوار میں زندہ چنوا دیتی----- یہ پرفن لڑکیاں بیوقوف لڑکوں کو خون کے آنسو رلواتی ہیں اور موت کی ہنسی ہنسواتی ہیں۔ اور پھر چٹ کہیں اور کسی کی ہو رہتی ہیں مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ ضمیر الو ہے اور رہے گا۔ کیاج ناب کی تھرڈ کلاس پسند ہے۔ وہ لڑکی جس میں نام کو عقل نہیں جس میں نہ قوم کی ترقی کا جوش نہ قربانی کا جذبہ----- نہ ملک کا پیار جو بی اے کرنے کے بعد بھی نہ مرد کی اصلی فطرت کو سمجھی اور نہ عورت کے جذبات سے واقف-----!
"مگر آپ کو اس کی اتنی دلداری کیوں منظور ہے----- آپ دوسروں سے

کھیلیں------ دیکھیں کون آپ کو روک سکتا ہے۔"

"بھئی واہ----- روکے گا کون---- پر اچھا نہیں لگتا اوہ----- مجھے بے چارے پر رحم آتا ہے-----" دوسرے-----؟"

"خوب رحم آتا ہے اسے جیسے...... جیسے دوسری کوئی نصیب نہ ہو گی۔" میرا خون کھول گیا-----!

"اے لو----- ملے گی کیوں نہیں...... یہ میں کب کہتی ہوں...... مل جائے گی مل ہی جائے گی-----"

راحت ہکلانے لگی۔

"مل ہی جائے گی----- اسے کمی نہیں۔ یہ تو...... وہ بیوقوف ہے۔"

"ہاں----- یہ بات ہے جبھی تو میں کہتی ہوں-----" راحت خوشی سے چہکی۔

"جب ہی تو کیا......" میں نے جل کر پوچھا۔

"اے بھئی یہی کہ...... بھئی مجھے نہیں----- نہیں معلوم ہے کہ مجھ میں تمہاری جیسی عقل نہیں اور نہ مجھ سے بحث کی جائے----- تمہیں یاد ہے کہ میں تو کوئی...... بالکل...... بھئی کبھی بحث کر ہی نہ سکی یہی تو بات ہے کہ ضمیر-----"

"ہاں کیا ضمیر-----" میں نے اس کی شکست سے خوش ہو کر کہا۔

"یہی...... یہ مجھے ضمیر پر...... یہی کہ بس خیال آتا ہے کہ وہ بے چارا......"

"اوہو۔ تم کتنے فخر سے اسے بے چارا کہتی ہو-----" میرا منہ کڑوا ہو گیا۔

"آج تو تم بے طرح بگڑ رہی ہو کیا ہوا----- کیا سعید نے ڈانٹا----- ابھی سے اینٹھتا ہے-----"

سعید کے نام سے میرے بدن میں پتنگے لگنے لگتے ہیں آپ ایک اور راحت جیسی روح رکھنے والے انسان ہیں آپ نے کمال فرمایا کہ ایک دفعہ مجھ پر عنایت

کی- کمال- میرے جواب سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کا کیا حال ہوا ہو گا پہلے تو ذرا متعجب ہوئے...... پھر خوب متعجب ہوئے- اور پھر اور زیادہ ہوئے بعد میں سنا اپنی غلطی پر بہت شرمندہ ہوئے- ضمیر سے بولے کہ میں انہیں غلط سمجھا تھا- میں سمجھتا تھا کہ شائد...... مجھے ان پر ترس آیا تھا------" خدا جانے یہ انہیں مجھ پر ترس کھانے کا کیا حق تھا اور کیسا ترس یہ مجھ پر آج تک واضح نہیں ہوا-

لیجئے اتنا لمبا قصہ سعید کا ہی ہو گیا وہ تو میں نے کہا نا کہ میں تو بات بھی کروں تو اس کو بھی گڑبڑا دیتے ہیں یہ دنیا والے------'

"ہونہہ------ سعید کی ہمت------ وہ ہی کیا چیز------ اگر سعید ذرا بھی خوش ہوتے تو مجھے یہ الفاظ کیوں استعمال کرنے پڑتے-"

اتنا چوڑا' چکلا اور اونچا انسان اور تم------ "کچھ" کہتی ہو-"

"انسان کی بڑائی چوڑے چکلے ہونے سے نہیں ہوتی عقل......"

"اونہہ------! آخر عقل مند ہونے کی کیا ایسی مار ہے اور عقل مند میاں میں ایسے کیا لعل جڑے ہوتے ہیں------ بیکار میں رعب گانٹھتا ہے اور پھر تم ہی کہتی ہو کہ مردوں کی حکومت نہ سہنی چاہئے میرے خیال میں ضمیر...... بھئی نہ میاں ضرورت سے زیادہ عقل مند ہو گا- نہ ہم کو دیا جائے گا-"

"تم میں کاش ذرا سوچنے کی ہمت ہوتی------ بحث کرنے لگتی ہو مگر...... خیر یہ اس وقت مسعود کا کیا ذکر------ میں تو کشور کو کہہ رہی ہوں-"

"کون کشور------؟"

"روفی والی------"

"کون روفی------؟"

"اللہ اتنا بننا-"

"اونہہ تو گویا میں تمہاری کشوروں اور رفیوں کے رجسٹر لئے ان کی مثنوی لکھا کرتی ہوں تمہارا مطلب کشور سے ہے------ وہ روفی کشور------؟"

"جی وہی----- روئے نہ تو غریب کیا کرے----- ہم عورتیں تو رونے کے لئے ہی پیدا ہوئی ہیں----"

یہ چند آخری الفاظ میں نے خود سے کہے اور ٹھنڈا سانس نہ روک سکی۔

"ہاں رونے سے آنکھوں میں چمک پیدا ہوتی ہے سارا گرد و غبار......"

"اور تمہارا دماغ خراب ہو جاتا ہے----- جاؤ راحت میں اس وقت تمہاری بدمذاقی سہنے کے لائق نہیں۔ جاؤ ٹینس کھیلو-----"

"ہوں ٹینس کھیلو----- جیسے تمہارے بھیا کو آتی بھی بڑی ٹینس ہے۔ میں تو کوئی کہ چلو بھئی ہو آئیں ذرا آپ ہیں کہ......" راحت برا مان گئی۔

"تو تم سمجھتی ہو میں بڑی خوش بیٹھی ہوں کہ تم مجھے آکر جلاؤ ایک تو تم بار بار ضمیر کو برا بھلا کہے جا رہی ہو آج ویسے ہی پریشان ہوں' کشور سے ملی تھی----- تمہیں کیوں یاد ہو گی کشور----- تم کوئی اس کی مثنوی تھوڑی ہی لکھ رہی ہو-----"

"ہاں ہاں پھر کیا ہوا-----؟"

"اس کی شادی ہو رہی ہے-----" میں نے اٹھتے ہوئے طوفان کو دبایا کئی دن سے دبا رہی تھی۔

"اچھا کب-----؟"

راحت کو کشور کے دکھ سے سکھ نہ پہنچے گا تو کسے پہنچے گا۔ کشو ٹھہری میری دوست اور میں ضمیر کی بہن اور ضمیر راحت کے زبردستی کے عاشق' میں نے ارادہ کر لیا کہ آج میں ہوں اور ضمیر' سور کہیں کا-----!"

"کیا اسی مرگھلے سے تو نہیں ہو رہی ہے-----" راحت ڈر گئی۔

یہ مرگھلا روفی کو کہا جا رہا تھا----- اور کیوں----- وہ اس لئے کہ راحت اس کے اشعار سے نفرت کرتی تھی کیوں-----؟ کیونکہ بس تھی----- فرماتی تھیں----- "بہت بے ڈھنگے شعر کہتا ہے۔" اب شعروں میں نہ جانے ڈھیلے اور تنگ شعر کیسے ہوتے ہیں-----؟"

"تم اسے مرگھلا کہتی ہو---- لیکن کشور کے دل سے پوچھو-
کشور تو سدا کی سٹرن ہے-"

"بس راحت زیادہ مت بنو---- تم سے زیادہ......"

"اے ہے معاف کرو---- باز آئی میں تمہاری کشور کے قصہ سے ختم بھی کرو----" راحت منہ بنا کر ٹانگیں سکیڑ کر لیٹ گئی-

"تمہیں معلوم ہے کہ وہ مر جائے گی---- مگر روفی کے سوا کسی سے شادی نہ کرے گی اور اماں کہتی ہیں کہ میں تو شوکت سے کروں گی----"

"اے ہے بڑھیا شادی کر رہی ہے----" راحت چونک کر اٹھی---- "تمہیں خدا کی قسم----"

"اوہو---- اوہو---- جیسے کچھ اترانے میں بھی مزا ہے- کشور کی شادی کا ذکر ہے اور بننے لگیں----"

"ارے...... میں سمجھی...... خیر...... پھر----؟"

"کشور کہتی ہے کہ زہر کھا لوں گی مگر روفی کے سوا......" باوجود ضبط کے مرا گلا گھٹ گیا-

"ارے...... مگر کون سا زہر کھائے گی---- میرے خیال میں سائنائیڈ ٹھیک رہے گا----"

"راحت کا کلیجہ اور لوہے کا دل اسی کو کہتے ہیں---- ساتھ کھیلے ساتھ پڑھے' ساتھ اسکول گئے اور پھر کالج---- مگر اس بے حس گوشت کے لوتھڑے کو......" افوہ...... میرا خون پھر کھول گیا-

"چپ رہو بے رحم! کاش بجائے انسان کے خدا تمہیں ایک چٹان بناتا جس پر...... جس پر......" مجھے کوئی پر معنی لفظ ہی نہ ملا- تمہاری بے رخی دوسروں کو دکھ نہ پہنچاتی---- ذرا سوچو بے قصور کشور نے تمہارے ساتھ کیا بدی کی ہے اس نے تمہیں کیا دکھ پہنچایا وہ جو ایک معصوم چڑیا سے بھی معصوم ہے- وہ جس نے سر جھکا کر دنیا کے دکھ سہہ لئے اور سہہ رہی ہے وہ جسے اس کی ظالم ماں دولت اور

شہرت کی بھینٹ چڑھا رہی ہے جو سر لٹکائے راضی برضا قربان گاہ کی طرف جا رہی ہے۔"

میری زبان کے ساتھ ساتھ عمدہ عمدہ جملے تیزی سے جا رہے تھے۔ جس نے قصائی کے سامنے گردن ڈال دی ہے اور خاموش اس کی چھری کی دھار کو دیکھ کر اپنا ہی خون جلا رہی ہے۔ تم بھی اسے دو باتیں کہہ لو۔ مگر دور ہو جاؤ میری آنکھوں سے جاؤ راحت-----"

"اے ہے توبہ...... ماشاء اللہ تم بڑی بد مزاج ہو-----" راحت ڈر کر سکڑ گئی۔

"ایسا میں نے کیا کہہ دیا۔"

"تم نے کیا کہا----- اور اوپر سے یہ بھی پوچھنے کی ہمت ہے تم اس کی موت پر ہنس رہی ہو اس کا خون ہو رہا ہے۔ تم ہنس رہی ہو۔ وہ مرغ لبسمل ہو رہی ہو اور تم ہنس رہی ہو----- اس کی لاش----- ہاں اس کی لاش پر تم دانت نکال رہی ہو-----" مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ سوائے ایک معصوم کے جنازے کے-----"

"اوہ...... مجھے ڈر لگ رہا ہے----- اللہ کا واسطہ چپ ہو جاؤ اچھی ذرا بجلی جلا دو مجھے ڈر لگ رہا ہے-----" راحت پیلی پڑ گئی۔

"تم سمجھتی ہو کہ تمہارے اوپر اس کا کچھ اثر نہ ہو گا۔ تم ہنستی ہی رہو گی اس کی موت پر----- مگر یاد رکھو راحت----- کشور تمہیں نہیں چھوڑے گی! وہ مر جائے گی----- مگر کیا وہ تم سے سوال نہ کر سکے گی----- اس کی روح......"

"ہائے بجلی جلاؤں میں...... اچھی بہن میرا دم نکل جائے گا۔"

راحت بزدلوں کی طرح چلائی اور جلدی سے اپنے پیر تخت کے اوپر رکھ لئے گویا تخت کے نیچے سے کشور کی روح ابھی سے اس کے پیر کھینچ رہی ہے۔

"تم اس کو بچاؤ----- بچاؤ گی----- تم اس کی مدد کرو گی-----"

میں نے ایک مسمیریزم کا تماشہ کرنے والے کی طرح کہا۔

"ہاں----- مگر بجلی-----" راحت کانپ رہی تھی-----" ہاں...... اب......"

"تم اس کی ماں کو مجبور کرو گی کہ وہ اس کے قتل سے باز آئے۔"

"مگر وہ------ وہ تو...... بہن ان کی ماں سے ڈر لگتا ہے مجھے میری آواز کی نرمی سے اس کی گئی ہوئی ہمت واپس آ گئی۔

"میں اور تم اس کی ماں کو مجبور کریں گے کہ وہ کشور کو زندہ دفن نہ کرے-----"

"ہاں تم کرنا...... ریحانہ تم بہت بہادر ہو------ تم...... تم واقعی بہت زبردست ہستی ہو۔ تم انسانیت کا بہترین مجسمہ ہو۔ ریحانہ اگر ہماری قوم میں ایسی ہی چند لڑکیاں پیدا ہو جائیں تو ہم غلام کیوں رہیں اور اب تم بجلی جلا دو------ میں زمین پر نہیں اتروں گی میرا جوتا بھی تو نہ جانے کدھر ہے-----" وہ کانپتی ہوئی آواز میں ایک بھٹکے ہوئے راستہ سے واپس لوٹ رہی تھی۔

"ہم اس سے لڑیں گے۔ اور یہ قربانی نہ ہونے دیں گے-----" میں نے اپنے آپ کو ایک طیارے پر سے بم گراتے محسوس کیا جن کے شعلے شوکت اور کشور کیم اں کو نگل رہے تھے۔ مگر...... وہ کشور خود جو اپنی ماں سے لڑے نا----- ایسی ننھی ہے کیا......"

"وہ خود لڑے-----! مجھے پھر جوش آیا----- وہ پڑھی لکھی ہے ہے تو کیا ہے۔ راحت وہ مشرقی عورت ہے----- وہ بے شرمی نہیں لاد سکتی----- وہ کہہ چکی ہے کہ چاہے کچھ ہو جائے وہ زبان ہلائے بغیر جان دیدے گی----- تم جانتی ہو وہ سدا کی کمزور دل ہے-----"

"تو بہن----- میں کون سی پہلوان ہوں-----" راحت اور کونے میں دبک گئی۔

"تم ہو یا نہ ہو----- مگر میں کروں----- میں خود کروں گی-----

راحت اب تک میں تمہیں بے رحم ہی سمجھتی تھی۔۔۔۔۔ اب معلوم ہوا کہ تم بزدل بھی ہو- چوہے سے ڈر جانے والی لڑکیاں۔۔۔۔۔ یہی تو ہماری قوم کی غلامی کی ہی ذمہ دار ہیں۔۔۔۔۔"

"اوہو۔۔۔۔۔ کوئی بھی نہیں۔۔۔۔۔" شکست خوردہ آواز میں کہا گیا۔

"سچ بتاؤ کشور...... وہ میرا مطلب ہے راحت کبھی میرے دل میں اپنی جنس کی برتری کا خیال بھی آتا ہے۔۔۔۔۔ کبھی یہ بھی سوچتی ہو کہ ہم کب تک ظالم مردوں کی حکومت سہیں گے۔۔۔۔۔ کب تک وہ ہمیں اپنی لونڈیاں بنائے چار دیواری میں قید رکھیں گے۔۔۔۔۔ کب تک یوں یہ ہم دبے مار کھاتے رہیں گے۔۔۔۔۔ بتاؤ بولو۔۔۔۔۔" مجھ پر پھر جوش سوار ہو رہا تھا۔

"سوچا کیوں نہیں۔۔۔۔۔ سوچتی ہی ہوں۔"

"کیا سوچتی ہو۔۔۔۔۔ ذرا بتاؤ کیا سوچتی ہو۔۔۔۔۔"

"یہی کہ بھئی۔۔۔۔۔ یہی سوچا کرتی ہوں کہ اب...... اصل بات تو یہ ہے کہ میں تو کچھ بھی نہیں سوچتی اور بھلا سوچوں بھی کیا......"

"یہی سوچو یہی، کہ کس طرح تم اپنی قوم اور ملک کے لئے قربانی کر سکتی ہو کس طرح تم اپنے علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتی ہو۔ اٹھو راحت ابھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا۔۔۔۔۔ یہ تمہارا ٹینس بھلا قوم کو کیا بلندی پر لے جا سکتا ہے۔۔۔۔۔"

"بلندی۔۔۔۔۔؟" راحت نے خاموشی کو توڑا۔۔۔۔۔ "ریحانہ مجھے آج یقین ہو گیا کہ واقعی تم کچھ ہو۔ تم...... میں تمہیں جھکی اور کج بحث کہا کرتی تھی مگر آج...... معاف کر دو۔۔۔۔۔ معاف کرو مجھے۔۔۔۔۔ تم کہو میں تم...... تمہارا کہنا مانوں گی۔ بتاؤ...... میں کل ہی اپنا ریکٹ توڑ دوں گی۔۔۔۔۔ کیوں توڑ دوں؟ اور میں ضمیر...... اسے بھی...... میں اب ٹینس ہی نہیں کھیلوں گی۔ میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔ میں اس سے کہہ دوں گی کہ اب تم اس خیال کو چھوڑو اور اب تمہیں اب انگوٹھی کے ڈیزائن تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔"

راحت کے لہجہ میں رقت اور پشیمانی بھری تھی۔
"مجھے تم سے یہی امید تھی----- میں کل کشور کے پاس جاؤں گی اور اسے یقیناً اس شکرے کے پنجے سے نجات دلاؤں گی----- تم چلو گی...... کیوں چلو گی نا-----؟"
راحت کچھ نیم مردہ اور پریشان سی چلی گئی- برآمدے میں میں نے اسے ضمیر کے شانے پر سر رکھے سسکیاں بھرتے دیکھا- نہ جانے وہ کیا بڑبڑا رہے تھے! اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے-----" وہ نہ جانے کسے کہہ رہی تھی۔
رات میرے لئے لمبی اور اندھیری تھی- مگر وہ مجھے ایک روشن ستارا نظر آ رہا تھا----- یہ میری قوت فیصلہ تھی جو میری ہمت بڑھا رہی تھی میں کشور کو بچاؤں گی----- میں ایک معصوم چڑیا کو شکرے کے خوفناک پنجوں میں سے نکال لاؤں گی۔"
شوکت کو اپنی دولت کا گھمنڈ ہے- اپنی صورت پر ناز ہے اور تعلیم پر اکڑتا ہے- یہ سب کچھ دھرا رہ جائے گا۔
سہ پہر کو راحت اور میں کشور کے یہاں پہنچ گئے----- اوہ- کشور کو دیکھ کر میرا دل مسل کر رہ گیا----- وہ مجھے عجیب گھبرائی اور کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی----- مجھے نظر بھر کر نہ دیکھ سکتی تھی شاید ان آنسوؤں کو وہ بے کار چھپانے کی کوشش کر رہی تھی جو خون بن کر اس کے رخساروں پر دمک رہے تھے- گو اس کی آنکھیں خشک تھیں وہ ایک شنگرفی رنگ کی ساڑھی پہنے آئینے کے سامنے جوڑے میں پنیں لگا رہی تھی- اسے اس بھڑکیلے لباس میں دیکھ کر میں سہم گئی کہ ستی ہونے کی تیاریاں ہو رہی ہیں مگر اب میں آ گئی تھی----- میں نے پیار سے اس کی ٹھوڑی چھوئی اور وہ ایک مردہ سی ہنسی میں ڈوب گئی۔
"ڈرتی کیوں ہو-----" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔
مگر وہ نظر بچا گئی----- اور ناخونوں کی پالش کی شیشیاں نکال کر اپنی ساری پر رکھ کر موزوں رنگ چھانٹنے لگی۔

"جو کچھ ہونا تھا ہو گیا----- میری قسمت------ راحت یہ ٹھیک ہے؟
اس نے راحت کو ایک شیشی دکھائی۔

"کچھ بھی نہیں ہوا----- تم جو چاہو گی----- وہی ہو گا۔ کسی کی مجال نہیں کہ وہ تمہاری مرضی کے بغیر تمہیں اس بے پسند کی شادی کی آگ میں جھونکے۔"

وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی----- اور جلدی سے ناخن رنگنا شروع کر دیئے۔

"تم ڈرتی کس سے ہو-----" وہ اور بھی گھبرائی----- "میری بات سنو کشور-----"

"چھوڑو ریحانہ ان باتوں کو ہاں یہ تو بتاؤ وہ تمہاری کتاب......"

"میری تاب تو ڈالو چولہے میں----- اور تم یہ بتاؤ آخر تمہاری والدہ؟"

"جانے بھی دو-----" اس نے جلدی سے بات کاٹی----- "ہاں راحت وہ تمہارے ٹینس کا کیا حال ہے-----" اس نے میرے پاس صوفہ پر بیٹھتے ہوئے کہا-----"

"ٹینس...... ٹینس...... تم...... وہ اب...... خیر بتاؤ۔ کہ شوکت کہاں ہیں-----" راحت نے پوچھا اور کشور کا رنگ تمتما اٹھا۔

"ہاں----- وہ شوکت صاحب کہاں ہیں----- ذرا مجھے ان سے بھی دو دو باتیں کرنی ہیں...... بے رحم انسان...... اگر انسان کہلانے کے......"

"ہٹاؤ بھی ریحانہ----- جو میری قسمت میں لکھا تھا-----" وہ ڈر کر اور بھی گھبرائی۔

"مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ کشور کس سے ڈری تھی۔ گھبرا گھبرا کر وہ برابر والے کمرے کی طرف ایسے دیکھتی تھی گویا اب کوئی شیر اس میں سے نکل کر اسے پھاڑ کھائے گا-----

شوکت----- میرا جی چاہا اسے...... نہ جانے دوں نہ جانے کیا کروں؟ یہ

معصوم لڑکی کے دل میں اس نے نہ جانے کیا دہشت بٹھا دی تھی۔ کہ وہ اس کے ذکر ہی سے گھبرا جاتی تھی----- میرا ارادہ اور بھی مستقل ہو گیا۔ فولاد کی سی سختی آ گئی------ میں نہ صرف کشور ہی کو بچاؤں گی۔ بلکہ میرا ہاتھ دور دور پہنچ کر ہزاروں بیکس لڑکیوں کو پناہ کے احاطے میں لے لے گا راحت کی طرح ساری کی ساری لڑکیاں قوم کی داسیاں بن جائیں گی اور پھر پھر ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔ آزاد-----!

"کشور چھ بجنے میں صرف، پانچ منٹ" قریب کے کمرہ سے ایک بھاری سی مردانہ آواز آئی اور کشور سر سے پیر تک لرز گئی۔ وہ جھپٹ کر سنگھار میز کے قریب گئی----- میں سمجھ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ دراز کھولے اور سم قاتل اس کے ہونٹوں سے گزرے میں پہنچ گئی۔ اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کی ساری کا پلو گر گیا اور وہ بے طرح گھبرا گئی۔

"کشور...... اتنی بزدلی...... جانتی ہو خود کشی......"

"اونہہ------ میں تو بٹوہ نکال رہی ہوں------ بیٹھو ریحانہ میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتی......"

"وہ کچھ چھپا رہی تھی مجھ سے------ بہت کچھ------!"

"کشور تیار ہو چکو------" وہ کریہہ اور بھرائی ہوئی آواز پھر گونجی اور کشور اور بھی پریشان ہو گئی------ میں جانتی تھی اس وقت اس کی کیا حالت ہو گی جس طرح سولی پر چڑھانے سے پہلے خوفناک گھڑیال بھیانک آواز میں گنگناتا ہے۔ اسی طرح یہ آواز...... پھر آئی۔

"اور لیلا رام کے یہاں بھی تو جانا ہے۔" اور پھر ایک سیٹی شروع ہو گئی۔

"ذرا ٹھہرو ریحانہ میں ابھی آئی۔" میں نے اسے روکنا چاہا۔ لیکن راحت نے میرا ہاتھ روک دیا۔

"ریحانہ کیا ہے۔ تم بالکل ہی بچہ ہو...... سنو تمہیں نہیں معلوم کہ"

میں نے اب اس کی بات ایک نہیں سنی۔ پاس کے کمرے سے وہی گڑگڑاتی

آواز قہقہہ لگا رہی تھی۔ دبے ہوئے گہرے قہقہے اور کشور گویا سسکیاں لے رہی تھی۔ باریک اور دبی ہوئی آہیں-----!

"لاحول ولا قوۃ-----" وہ موٹی آواز سے بولی۔

"سنو تو...... سنو تو...... کشور کی پریشان آواز آئی۔ وہ اس مردود کی التجائیں کر رہی تھی پھر ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی کسی کو پکڑ کر گھسیٹ رہا ہو اور وہ خوشامد کرے جان کنی میں...... پناہ مانگے اور پھر اور بھی گھٹی گھٹی آواز آنے لگی گویا کوئی زبردست درندہ کشور کو جھنجھوڑ رہا ہو۔ میری کنپٹیاں پھڑپھڑانے لگیں۔ نسیں کھچ گئیں-----اور ہاتھ اکڑ گئے۔ وہ وقت آن پہنچا تھا۔ میں ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"ہیں ہیں ریحانہ کیا کرتی ہو-----" راحت نے مجھے روکا۔

"کشور...... میری کشور-----" میں بیساختہ چیخ پڑی اور دوسرے لمحے دروازے کا پردہ الگ ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر کے لئے میری ساری طاقتیں سلب ہو گئیں بیچوں بیچ کمرے میں ایک الماری سے ذرا ہٹ کر شوکت کے بھیانک اور ظالم بازوؤں میں ایک مردہ چڑیا کی طرح کشور نڈھال ہو رہی تھی اور وہ...... یہ سمجھ لیجئے کہ کبوتر کو آپ نے کبھی بچے کو دانہ بھراتے دیکھا ہے۔ بس بالکل ویسے ہی-----بالکل اسی طرح-----دوسرے لمحے شوکت تو سر کھجا کھجا کر پاس ٹنگی ہوئی تصویر میں رنگوں کی آمیزش دیکھ رہے تھے اور کشور جلدی جلدی اپنا بٹوہ کھول اور بند کر رہی تھی۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور چہرہ لال تھا۔

"یہ-----یہ شوکت ہے ریحانہ...... شوکت......" کشور کہہ رہی تھی۔

جب میں برآمدے میں سر لٹکائے لڑکھڑائے قدموں سے واپس ہو رہی تھی تو میں نے ضمیر کو ایک لمبا سا پارسل لئے دیکھا اور اس میں سے اس کے لئے نیا ریکٹ نکال رہا تھا۔ وہ خود اپنی انگلی پر انگوٹھی کی چمک دیکھنے میں غرق تھی وہ ہنسے۔

مگر میرے کان میرے جسم سے دور کہیں موت کا سا نغمہ سن رہے تھے اور میری آنکھیں فضا میں ہزاروں جنازوں کے جلوس گزرے دیکھ رہی تھیں۔

❀❀❀

سفر میں

کاش یہ ریلیں ذرا کم ہلا کرتیں۔۔۔۔۔۔ گھڑ گھڑ۔ پھٹ پھٹ۔ جھڑ جھڑ معلوم ہوتا ہے کہ پہیے اب نکلے اور اب نکلے۔ ریل میں بیٹھ کر انسان کن کن عجیب و غریب زاویوں سے ہلتا ہے آڑا ترچھا۔ پھر گول گول چکروں کی صورت میں۔ اور پھر شمال سے جنوب کی طرف اور کندھے مشرق و مغرب کی سمتوں میں جنبش کرتے ہیں۔ اور لٹکی ہوئی ٹانگیں مثلث بنانا شروع کر دیتی ہیں۔ پانی کا گلاس کئی دفعہ نشانہ باندھنے کے باوجود بھی کبھی ٹھوڑی اور کبھی ناک سے ٹکرا کر پانی چھلکا دیتا ہے۔۔۔۔۔ اس سے تو چھکڑے ہزار درجے بھلے تھے جب ہلتے ہلتے انسان تھک جائے تو ٹھہرا تو سکتا ہے مگر یہاں ریل میں تو بس ہلو ہلو اور پاگل ہو جاؤ۔

سامنے بیٹھا ہوا انسان ہلنے کے ساتھ ساتھ پھسلنے بھی لگا۔ اس کی ٹانگ جو پہلے ہی ران تک کھلی ہوئی تھی اور بھی آگے کھلنے لگی۔ نہ جانے کس عجیب طریقے سے دھوتی باندھی تھی کہ گزوں کپڑوں لپٹا ہونے کے باوجود ہر جنبش خطرناک طور پر اُسے برہنہ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ کاش وہ جاگ جائے۔ میں نے دعا مانگنا شروع کی۔ کاش وہ ایک دم ہی تڑپ کر اس کپڑوں کی گٹھڑی میں سے نکل آئے۔ یہ سسک سسک کر جو اس کی دھوتی برابر کھسک رہی ہے اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ ایک دم فیصلہ کر دے۔ تین اسٹیشنوں سے یہی جانکنی سی طاری ہے۔ بڑی معیوب سی بات ہے لیکن ایسے موقعہ پر خواہ مخواہ نظر اٹھتی ہے اور ہے یہ بڑی عجیب بات کہ کوئی اسے کچھ نہیں کہتا۔

میری سیٹ سے ذرا ہٹ کر ایک پوری سیٹ لبالب ایک عورت سے بھری

ہوئی تھی۔ پہاڑ کی پہاڑ عورت۔ نہ جانے کیسے ایک بچے کو دودھ پلا رہی تھی ساری رات بچہ دودھ پیتا رہا اور وہ بالکل غافل سوتی رہی جب کوئی اسٹیشن آجاتا تو بچہ کوں کوں کر کے چپڑ چپڑ منہ مارنے لگتا۔ عورت کا پلپلا پیلا جسم ہر جنبش پر مختلف سمتوں میں ہل رہا تھا۔ بچہ پیٹ پر چھپکلی کی طرح چپکا ہوا برابر دودھ پی رہا تھا۔ گویا وہ پیدا ہی اس ضروری کام کے لئے ہوا ہے۔ وہ رات بھر دودھ پیتا رہا اور اب بھی پی رہا تھا نہ جانے اسے کتنا اور پینا تھا اوندھا ہونے کی وجہ سے اس کی ناک پچکی ہوئی تھی جس میں کی غلاظت کے لئے بلبلے نکل کر ہوا میں پھوٹ رہے تھے۔

مشاہدہ

کاش بچہ دودھ ذرا کم پیتا۔۔۔۔۔ اور وہ ننگی ٹانگ والا مسافر دھوتی سنبھال لیتا تو میرا سفر اتنا تلخ نہ ہوتا۔ ریل کے جھٹکوں نے نئے زاویئے اختیار کر لئے تھے اور جسم کو ذرا مختلف اطراف میں ہلنے میں نسبتاً سکون مل رہا تھا۔

جب تک ریل چلتی رہتی ہے۔ ڈبہ کی بدبو ذرا دبی رہتی ہے ریل رکتے ہی پسینہ اور میلے کپڑے کے بھبکے اٹھنے لگے۔۔۔۔۔ باہر چند بے فکرے نوجوانوں نے ٹہلنا شروع کیا۔ کاش کوئی ہمارے نوجوانوں کو آوارگی سکھا سکتا۔۔۔۔۔ جی ہاں آوارگی بھی ایک ہنر ہے۔ مجھے یاد ہے کہ چوراہوے پر سے گزرتے وقت ایک انگریز سپاہی کھڑا رہتا تھا۔ بڑی شرم کی بات ہے۔ پھر وہ کچھ اس مزے سے "ٹوئی" کر کے سیٹی بجاتا تھا کہ لطف آجاتا تھا اور اس کی کرنجی آنکھ شرارت سے جھپکتی تو ہم لوگ بے اختیار مسکرا دیتے تھے۔

خوب!

ذرا غور کیجئے۔۔۔۔۔ بچہ، مسافر، جس کی دھوتی نئی کروٹ لینے کے بعد اور بھی خطرناک ہو چلی تھی۔۔۔۔۔ ریل کے ہچکولے اور پھر غلط فہمی کا شکار بیسیویں صدی کے نوجوانوں کی بدمذاقی۔ جی چاہا۔۔۔۔۔ ان میں سے ایک کو بلا کر کہوں بھائی یہ شعر جو تو گنگنا رہا ہے بہت پرانا ہے "شعلہ طور" میں سے کوئی جلتا ہوا شعر پکڑ اور تیرے بالوں میں جو آونلے کا تیل ہے آدھ درجن سروں کے لئے کافی ہوتا اور تیری بائیں مونچھ دائیں مونچھ سے ذرا اونچی کٹی ہے۔ ابھر ابھر کر تیرے ذوق کی داد دے رہی ہے اور پان اتنا مت چبا۔۔۔۔۔ تیری کلیاں بہت نمایاں ہیں۔۔۔۔۔

پان کی پیک میں لتھڑے کر بہت بھیانک ہو رہی ہیں اور تو اتنی ڈھیلی دھوتی مت پہن ----- اور کرتا بھی بہت بڑا ہے یہ جو تو نے سنیما میں اشوک کمار وغیرہ کو بے گریبان کے بڑے بڑے تھیلے پہنے، دیکھا ہے۔ وہ تیرے اس ٹھنگنے سے قد پر اچھے نہیں لگتے اور...... " مگر وہ ایک نئی بیاہی دلہن کو ڈبے میں سے جھانکتے دیکھ کر عجیب بھیانک حرکتیں کرنے میں مشغول----- بھلا میری کیوں سنے گا----- آہ میری آنکھیں۔ جی چاہا مٹھی بھر کے ریت اٹھا کر جھونک لوں۔ ریل کا کوئلہ نہ جانے کتنا گھس گیا میرا جی بری طرح متلا رہا تھا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سارا دودھ بچہ پی رہا ہے اور پی چکا ہے میرے ہی حلق سے گزر رہا ہے اور منہ کا مزہ بدلنے کے لئے میں نے ڈلیا میں سے تنکے توڑ کر چبانا شروع کیے۔

خوب!

دو قلی ہنسی مذاق میں باہم گتھم گتھا عجیب و غریب گالیاں دے رہے تھے میں نے سوچنا شروع کیا کہ دوسری قوموں کی گالیاں بھولی اور غیر دلچسپ ہوتی ہیں ہندوستانی دماغ کم از کم گالیوں کی ایجاد میں تو سب قوموں سے آگے ہے جس نکتہ پر ہمارے یہاں گالیوں میں زیادہ زور دیا جاتا ہے اس کا اور لوگوں کو گمان ہی نہیں۔ ہزاروں آرٹ تو دنیا میں لاپرواہی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ہمارے ہندوستانیوں کے آرٹ کو تباہ بھی کر ڈالا۔

انگوٹھے کاٹ ڈالے گئے کپڑے بنانے والوں کے----- آپ اس بچہ کو لیجئے اور اس کی ماں کو جو اٹھارہ گھنٹے سے دودھ پی رہا ہے فی گھنٹہ حساب لگائیے تو کتنا پی چکا ہو گا۔ اور وہ ماں----- اگر کسی تہذیب یافتہ ملک میں ہوتی تو نہ جانے کتنے تمغے اور میڈل مل چکے ہوتے----- اور مجھے بڑے بڑے حروف میں بچے اور ماں کی حیرت انگیز حرکتوں کے متعلق "سنسنی خیز" الفاظ نظر آنے لگے۔ دبلا پتلا بچہ! باوجود اس تندہی سے جتے رہنے کے حیرت! حیرت زدہ ہوتے ہوتے میرا سر ڈگنے لگا۔ اور میں نے اونگھنے کی کوشش کی۔

کھٹ کھٹ کھٹ----- کسی نے سر پر ہتھوڑے مارنے شروع کئے، ٹکٹ بابو صاحب----- اپنا سروتہ کھڑکی کے پاس کھٹکھٹا رہے تھے تھرڈ کلاس میں سفر

کرنے والوں کے نہ تو شائد بھیجا ہوتا ہے اور نہ اس میں احساس----- جی چاہا پاگل ہو جاؤں-----

پاس ہی اس سکینڈ کلاس میں ایک کھدر پوش لیڈر نہ جانے رات کو کون سے اسٹیشن پر سوار ہو گئے تھے- جب وہ اسٹیشن پر اتر کر سر کھجاتے یا اخبار خریدتے تو میں برابر انہیں غور سے دیکھتی- ان ہی دنوں میں ایک کتاب پڑھ رہی تھی- جس میں ایک معمولی عورت نے ایک بڑے مشہور آدمی پر طاری ہونا شروع کیا----- اور ایسی پیچھے لگی کہ آخر میں اسے مرعوب کر کے چھوڑا- میرا ارادہ بھی ہمیشہ ہی سے کوئی ان ہونی اور سنسنی خیز حرکت کرنے کا ہے جو اور عام لڑکیوں نے نہ کی ہو- پہلے میں سوچا کرتی تھی ایڈیٹر یا کوئی مشہور مصنف ٹھیک رہے گا- پھر میری رائے بدل گئی----- آج کل لیڈر ذرا آنکھ میں جچتے ہیں-----!

اور ان لیڈر صاحب کی آنکھیں بڑی بڑی کھلی ہوئی پیشانی- دھوتی کے پلو سے کھیلتے ہوئے وہ خاصے شریف آدمی معلوم ہو رہے تھے- کنپٹیوں پر سفید سفید بال جھلک رہے تھے جو ان کے مفکر ہونے کا ثبوت دے رہے تھے- جنکشن پر میں نے جان بوجھ کر بک اسٹال پر ان سے ملاقات کر لی-

"ہماری استریاں ہی ہمیں آزاد کرا سکتی ہیں-----" انہوں نے میری ساری کے موٹے کھدر سے مرعوب ہو کر کہا-

دل میں تو مجھے شرم آئی کہ ساری لیتے وقت میں نے ملکی بہتری سے زیادہ سٹائل پر توجہ دی تھی- مگر انہیں کیا معلوم-----؟

میں نے جلدی جلدی ان سے نصیحتیں لینا شروع کیں-

"صاحب عورتوں کی مدد کے بغیر ہندوستان آزاد نہیں ہو سکتا-----"

مجھے یاد آگیا جب کالج کے زمانہ میں ایک دفعہ خوش رنگ جھنڈے لے کر ہم لوگ کھدر کی ساریاں پہن کر نکلتی تھیں- سلطانہ کی پیلے رنگ کی ساری بھیانک معلوم ہو رہی تھی اور ششی نے اپنے مور کے رنگ کی ساڑی سنبھالتے ہوئے مجھے جلوس کے درمیان میں ہی اس کی ساری کے رنگ پر توجہ دلائی تھی اور اس وقت

سلطانہ کے کانوں پر پڑے ہوئے بال کنٹوپ کی طرح معلوم ہو رہے تھے-----
ہاں زینب غضب کی لگ رہی تھی پر وہ راستہ بھر نریندر صاحب سے فن کرتی گئی تھی- جوگی بے چاری نے ششی سے کتنی دفعہ ساری مانگی- مگر ششی کی ساری ساڑیاں جلوس والی لڑکیوں نے پہلے ہی لے لی تھیں اور وہ اسی روز نئی کھدر کی ساری لائی جس کے کلف کی بو سے ناک اڑی جا رہی تھی-----"

"استریوں کو کسی کے دکھ کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے-" وہ بولے-

لیجیے- بھلا ہم لوگ دکھ کی پرواہ کریں گے- جلوس میں جاتے وقت دل سے دعائیں مانگ رہے تھے- کاش پولیس مزاحمت کرے- ورنہ یہ تو کچھ بات نہ ہو گی- کہ جلوس نکلے اور یوں ہی گشت لگا کر چلا آئے- جوگی تو یہاں تک کہتے تھے کہ کاش لاٹھی چارج ہو ہم پر-----" مگر وہ تو ہماری قسمت میں نہ تھا----- پولیس کو جیسے ہمارے دل کا حال معلوم ہو گیا اور جلوس پھسپھسا ہی رہتا اگر ایک جھگڑا نہ اٹھ کھڑا ہوتا- وہ کچھ "بندے ماترم" اور "ہندوستان ہمارا" پر رسا کشی ہوئی----- ششی کو کھانسی آ گئی----- اور یہ جھگڑا یوں ہی دب گیا-

جس بات میں عورتیں حصہ نہ لیں تو جانو گاڑی کا ایک پہیہ نہیں-

مجھے یاد آیا کہ بہت دن ہوئے میں نے ایک فلم دیکھا تھا اس میں سوائے ایک بوڑھی ہوٹل والی کے اور کوئی عورت نہ تھی- اس قدر غیر دلچسپ فلم تو میں نے ساری عمر نہیں دیکھا ہم سارا وقت اسی انتظار میں رہے کہ اب کوئی عورت آئے اور اصل تماشہ شروع ہو اور سچ کہتی ہوں کہ ایک پہیہ کی گاڑی تو پھر بھی چل جائے وہ فلم تو ذرا بھی نہ چلا-

اور پھر مجھے ایک دم خیال آیا کہ ہم لوگ زندگی کو گاڑی سے کیوں تشبیہ دیتے ہیں----- چکی سے کیوں نہیں دیتے----- یا چمٹے سے کیوں نہیں- یہ خیال بڑا بے تکا----- پر آ گیا دل میں----- اگر لیڈر صاحب کو میرے دل کی باتیں معلوم ہو جائیں تو بس نہ جانے کیا کرتے وہ کتنی دیر تک ایک کوڑھ مغز سے سر مارتے رہے جس کے خیالات کا سر نہ پیر----- مگر اس میں میرا کیا قصور کہ

ایک بات پر مجھے ہزاروں الٹی سیدھی باتیں یاد آ جاتی ہیں۔

پھر کچھ موجودہ نظام تعلیم کا ذکر ہونے لگا۔ دو تین اور آ کر سننے لگے ان میں سے ایک کی ناک سکڑے ہوئے لمبے چہرے پر عجب چیز لگ رہی تھی گویا ریگستان پر ایک تنبو سا تنا ہوا ہے دانت ان کے بھی پھپھوندی لگے ہوئے تھے۔ میرا دل چاہا کہ کوئی ان کے دانت مانجھ دے اور لیڈر کا لکچر سننے کے بجائے میں حیرت میں ڈوبی یہ سوچ رہی تھی کہ اس شخص کی بیوی کیا کرتی ہو گی کاش کوئی ان کے دانت مانجھ دیتا اور میرا دل گھبرانے لگا جی چاہا کسی نہایت ہی خوبصورت آدمی کو دیکھوں جس کے دانت پھپھوندی چڑھے ہوئے نہ ہوں اور جس کی ٹانگ دھوتی میں سے ران تک نہ کھلتی ہو اور جس کے کپڑوں میں سے ہلکی ہلکی پنتتین کی خوشبو آ رہی ہو اور اس کے سینے پر سر رکھ کر اتنا روؤں کہ سارا کوئلہ جو راستہ بھر میری آنکھوں میں جھونکا گیا تھا دھل جائے اور بچے کے تصور سے جو میرا جی متلایا تھا۔

اور وہ تین آوارہ مزاج بننے کی کوشش کرتے ہوئے نوجوان! قلی اور ان کی گالیاں، ریل کے ہچکولے...... یہ دنیا ساکت ہو جائے...... اور بس-----!

پنکچر

"پنکچر!"

اوہ بس دم ہی تو نکل گیا----- کمبخت دو آنے گھنٹہ لیتے ہیں اور ایسی گھنی گھنائی سائیکل پکڑا دیتے ہیں۔ کتنی دفعہ ابا میاں کو لکھا کہ بھئی ایک سائیکل دلا دیجئے، چھٹی ہو----- کالج کا کام ویسے ہی نہیں چلتا----- کون میل بھر گھسٹ کر روز روز جائے اور پھر اس دھوپ میں-----؟ توبہ کیجئے مگر وہ کہتے ہیں کہ سب بناوٹ ہے۔ کوئی ضرورت سائیکل کی نہیں لڑکیوں کو تو اترانے کے سوا کچھ آتا ہی نہیں----- سائیکل ویسے بھی کوئی سواری نہیں----- نٹوں کا کھیل ہے۔ پالکیاں، ٹالکیاں----- ڈولیاں سب اڑ گئیں----- پہلے۔ تو اچھے اچھے داڑھی والے تک پالکیوں میں سوار ہوا کرتے تھے۔

اور اب-----؟ یہ "اب" ملعون نہ جانے کیوں پیدا ہو گیا----- خدا میں سب کچھ طاقت ہے وہ چاہتا تو یہ "اب" دنیا میں آتا ہی نہیں۔ وہی سہانا "جب" رہتا اور پھر خدا کو اس "اب" کے ساتھ عورت کیوں پیدا کرنی تھی کیا بنا عورت کے دنیا نہ چلتی؟----- ہاں ذرا بچوں کا سوال ٹیڑھا سا تھا سو وہ بھی کیا تھا۔ مردوں ہی کی پسلیوں سے کھٹا کھٹ بچے پیدا ہوتے اور کچھ کھا پی کر پل ہی جایا کرتے----- کیسا سکون ہوتا----- شانتی ہی شانتی مگر اب تو پنکچر ہو چکا تھا۔

"لعنت ہے۔" میں نے ٹائر کو لاچاری سے ٹٹول کر سوچا اور ایڈنا کے انتظار میں ریت پر اکڑوں بیٹھ کر سوکھے تنکوں سے زمین پر پھول کاڑھنے لگی-----!

یہ ایڈنا ہی کی رائے تھی کہ آج دور کی سیر رہے بھلا شہر سے چار میل مرنے

کی مجھے کیا ضرورت آن پڑی تھی۔

سوچا لاؤ ذرا پہیئے کو دیکھوں۔ مگر خاک جو عقل نے کام کیا ہو کالجوں اور اسکولوں میں سینا پرونا اور کھانا پکانا تو سکھایا جاتا ہے مگر یہ نہیں ذرا پنکچر جوڑنا بھی سکھا دیا جائے۔ کہو بھلا پڑھ لکھ کر ہم کھانے پکانے ہی کو تو بیٹھے رہیں گے۔ چٹورپن عورت کی خصلت میں ہے ہی نہیں اور خدا کسی کو ایسا میاں نہ دے جو ہر وقت زبان کی چاٹ میں مبتلا رہے۔ جو بھوسی چونی سامنے رکھ دی ----- صبر شکر سے کھا لی اور پھر یہ سائیکلیں کون جوڑے گا؟ لیجئے جو ذرا پہیہ کھولنے کی کوشش کی تو انگلی الگ پچی اور سارے ہاتھ سڑ گئے بدبو سے -----

"ٹن ----- ٹن -----" سائیکل کی گھنٹی بجی۔ میں سمجھ گئی ایڈنا آ گئی۔ اور اب مجھے جلائے گی ----- مگر میں نے بھیا ارادہ کر لیا ----- کہ لڑ ہی تو پڑوں گی۔

"ہوں پنکچر؟" کوئی بولا ----- واضح رہے کہ بولا ----- بولی نہیں ----- کوئی۔ راہ گیر تھا ----- گو میں قطعی رومانس کے موڈ میں نہ تھی۔

چونک پڑی۔

"یہ ----- جی ہاں ----- پنکچر ہو گیا شائد -----" میں نے معصومیت سے کہا۔

"واقعی ----- !" وہ بے ہنگم سا لمبا انسان مذاق اڑانے کے لہجہ میں بولا۔

"جی ہاں ----- ! کوئی کانٹا چبھ گیا شائد ----- !" میں نے معصومیت کی دال نہ گلتے دیکھ کر اونچی اور کھری آواز سے کہا۔

"واقعی" پھر وہی کمینہ اور تمسخرانہ گفتگو کاش کوئی اسے خواتین سے گفتگو کرنے کا سلیقہ سکھاتا -----"

"ہیں -----؟ یہ آپ کیوں پوچھتے ہیں ----- گویا پنکچر نہیں اور میں......"

"جی ہاں ----- پہیہ بڑی آسانی سے کھول کر ہوا نکالی جا سکتی ہے۔"

"مگر یہ کیوں۔۔۔۔۔؟"

"یہ۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ ذرا یوں ہی۔۔۔۔۔ ذرا۔۔۔۔۔" لمبے آدمی کا لمبوترا چہرہ مکارانہ طریقے سے مسکرایا۔۔۔۔۔ واضح رہے کہ صورت سے کوئی شبہ نہ ہوتا تھا کہ خاصہ شریف انسان معلوم ہوتا تھا۔

"اس سے آپ کا مطلب۔۔۔۔۔؟"

"یہی کہ شوق۔۔۔۔۔ آپ لوگوں کو ذرا شوق ہوتا ہے کہ جہاں کوئی رومینٹک جگہ دیکھ لی۔ اور کوئی حادثہ لے بیٹھیں۔۔۔۔۔ پنکچر ہو رہے ہیں۔۔۔۔۔ دریا میں ڈوبی جا رہی ہیں۔بدمعاش لئے جاتے ہیں۔ جہاں دیکھو۔۔۔۔۔"

"آپ یقیناً بہک رہے ہیں۔۔۔۔۔" میں نے جل کر کہا۔۔۔۔۔ نہ جانے کیوں یہ طعنے میرے دل میں چبھ گئے۔۔۔۔۔

"جی۔۔۔۔۔ بہک ہی تو رہا ہوں۔۔۔۔۔ یہی تو مصیبت ہے' ابھی کل ہی تو کتاب میں لکھا دیکھا کہ ایک حسین لڑکی۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔ دوشیزہ کی موٹر راستہ میں بگڑ گئی اور ادھر سے۔۔۔۔۔

آپ بتائیے کون آیا۔۔۔۔۔؟" وہ یہ کہہ کر کریہہ ہنسی ہنسا۔

"میں اور بھی جل گئی۔۔۔۔۔" کوئی جانور۔۔۔۔۔ شیر یا بھیڑیا۔۔۔۔۔" میں نے بن کر کہا۔

"آپ بنئے مت۔۔۔۔۔ وہی پریوں کا شہزادہ۔۔۔۔۔"

"ہوں تو پھر مجھے کیا اس سے۔۔۔۔۔" میں نے سوچا۔۔۔۔۔ اب یہ آیا ہے تو بابا تو سیدھی طرح ایک مصیبت زدہ خاتون کی مدد کرے۔۔۔۔۔ جو اس کا اخلاقی فرض تھا۔۔۔۔۔ ورنہ غارت ہو یہاں سے۔۔۔۔۔

"مگر پھر کیا ہوا۔۔۔۔۔؟ یہ معلوم ہے آپ کو۔۔۔۔۔؟" وہ اور بھی بے تکلفی سے بولا۔۔۔۔۔ اور بڑے انداز سے سر ایک طرف کو کر لیا۔

"آپ عجیب انسان ہیں۔۔۔۔۔" میں نے واقعی تعجب سے کہا۔

"اوہ اب آپ رومیشک تو بنئے مت-----" اس نے رکھائی سے میری سائیکل ٹٹولی-----!"

"اصل بات یہ ہے' میں سمجھا----- خیر جانے دیجئے----- آپ لوگوں کو عموماً" یہ عادت ہوتی ہے کہ جہاں رومانس کی تلاش ہوئی- اور-----"

میں حیرت سے اس انسان نما جانور کو دیکھنے لگی-

"اگر آپ ایمانداری سے کہہ دیں----- دیکھئے دیکھئے آپ تیور دکھائیں گی تو یاد رہے کہ----- ہاں سنا آپ نے میں اس قسم کا آدمی نہیں' سمجھیں صاحب؟ اگر واقعی آپ کی سائیکل بگڑ گئی ہے تو ازراہ نوازش میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں-----" اس نے کوٹ اتار کر آستینیں چڑھائیں-

میں نے ساری عمر ایسا انسان نہیں دیکھا تھا جس نے میرا کام کرنے سے انکار کیا ہو لڑکے خواہ مخواہ بغرض احتیاط ہماری سائیکلوں میں ہوا بھر دیتے اگر یونیورسٹی گیلری میں اندھیرا ہوتا تو ہر لڑکے کی خواہش ہوتی کہ پہلے سے پہلے جا کر روشنی جلانے کی سعادت حاصل کرے ایسا کبھی اتفاق ہوتا کہ کوئی نظر نہ آتا- تو ہم بالکل لاچار گھبرائے ہوئے اندھیرے میں متوجہ کن آوازیں نکالا کرتے اور سوئچ کی تلاش میں بڑا ہی غل پڑتا- یہاں تک کہ کوئی اللہ کا شیر آ کر ہمیں اس مصیبت سے چھڑاتا- یہ لڑکے کالج بھر میں شریف گنے جاتے تھے-

مگر یہ بے ڈول انسان کچھ عجب کوڑھ مغز تھا-

"یوں کام نہیں بنے گا-" اس نے ادھر ادھر سے سائیکل کو دیکھ کر کہا- "اسے سامنے رہٹ پر لے چلئے- وہاں پانی میں پنکچر مل جائے گا-"

اور بے توجہی سے اپنا کوٹ اور سائیکل کو اٹھا کر رہٹ کی طرف چلا میں نے دل میں سخت برا مانتے ہوئے اپنی سائیکل گھسیٹی- مگر کنوئیں پر پانی نام کو نہ تھا-

"پانی تو ہے نہیں-----"

"پھر-----؟" میں نے ہراساں ہو کر پوچھا-

"پھر-----" وہ مسکرایا اور میں ڈری کہ کمبخت پھر مجھے شرمندہ کرنے کی

فکر میں ہے-----

"ذرا یہ پہیہ گھمائیے------ پانی ہی پانی ہے--- میں نالی بند کرتا ہوں-"

وہ موری سے کھیلنے لگا-

آسان کام خود کر کے مجھے رہٹ پر جتا دینا کہاں کی انسانیت تھی اور پھر سگریٹ جلا کر خوب ہوا میں دھواں پھیلانا شروع کر دیا-

اس نے پانی میں ٹیوب ڈال کر پنکچر تلاش کرنا شروع کیا- میں لاچار غریب صورت بنائے اس کے پاس بیٹھ رہی اس کا کوٹ جو زمین پر پڑا تھا- میں نے اس کی عزت افزائی کے لئے اپنے گھٹنے پر ڈال لیا کہ شائد اس کا غصہ کم ہو اور اس سے زیادہ ایک انسان کی کیا عزت افزائی ہو سکتی ہے- نہ جانے کیا سوچ کر اس نے مجھے غضب ناک آنکھوں سے دیکھا اور غرایا-

"ہوں------ لاحول ولاقوۃ----- آپ نے پھر مجھے الو بنانا شروع کیا- اس نے ٹیوب پھینک دیا- واہ آپ مزے سے بیٹھی ہیں خود کیوں نہیں بناتیں------" وہ دور کھڑا ہو گیا-

میں ڈر کے اچک پڑی---- جلدی سے کوٹ دور پھینکا اور بڑبڑاتے ہوئے خود پنکچر ڈھونڈنا شروع کیا- وہ خود دھواں اڑا اڑا کر منڈیر پر بیٹھا دیکھتا رہا-

جب کوئی نیا اور جنگلی سا انسان آپ کی ہر مناسب بات کو بھی خواہ مخواہ اعتراض سے دیکھے جائے تو نہ جانے کیوں جی سا گھبرانے لگتا ہے- اوپر سے بولا-

"یہ آپ اترا اترا کر پنکچر کیوں چھوڑ دیتی ہیں------ ابھی ابھی آپ کا ہاتھ وہاں پڑا تھا------"

"نہیں تو----- کہاں-----؟"

"افوہ! کس قدر بنتی ہیں------"

"بننا وننا سب رخصت- مجھے پھر غصہ آیا------ آپ کو کیا------ جائیں یہاں سے-----"

"اوہو------ یہ لیجئے----- آپ نہ جانے کیا سمجھی ہوں گی-----

لاحول ولا قوۃ------" اور وہ چلا۔

"مگر سنیئے تو------" اس نے مڑ کر کہا۔ "سلیوشن اور پمپ تو آپ کے پاس ہوگا ہی۔ بھلا جب آپ کے پاس سب کچھ سامان تھا تو وہاں کیوں پسر کر بیٹھ گئی تھیں آپ لوگوں کو خدمت لینے کا تو بس چسکہ پڑ گیا ہے------"

"آپ بے ہودہ انسان ہیں------ میرے پاس نہ پمپ نہ سلیوشن------" میں نے کھسیا کر چلانا شروع کر دیا۔

"اچھا یہ بات ہے------ ہوں------ تو پھر کہیے ہوا کیا منہ سے بھریں گی۔" اس نے ایک قہقہہ بھیڑیے کی طرح پیچھے سر پھینک کر لگایا۔

"آپ کی بلا سے------" میں نے پنکچر منحوس مسل کر کہا۔

"پھر------ پھر وہی رومینٹک بننا------" نہ جانے اس شخص کو رومانس سے کیوں جلن تھی------!

"آپ کس قدر وحشی ------ ہیں------" میں نے ٹیوب دور پھینک کر کہا اگر آپ کا کوئی کام ہوتا تو مجھے مدد دینے میں کبھی بھی------ اس قدر کبھی------ بھی میں اتنی بدتمیزی نہ کرتی......"

"دیکھو جی------ ہم نہ تو وحشی اور نہ جنگلی اور ہم کام سو دفعہ کریں۔ مگر جو تم اینٹھ کر ہمارے اوپر دھونس جماؤ تو------ واضح رہے کہ------"

"مگر آپ بدتمیزی کیوں کرتے ہیں------" میں نے گھبرا کر کہا۔

"تم بھی تو بدتمیزی کر رہی ہو------ دیکھو نا اب جو تمہاری جگہ کوئی لڑکا ہوتا خدا کی قسم جوتے مارتا اس کے اور دوسرے پہیہ میں بھی پنکچر کر دیتا انتہا ہے گدھے پن کی کہ نہیں۔ نہ سلیوشن نہ پمپ اور جنگل کی سیر کو جا رہی ہیں جانتی ہی ہیں کوئی مل ہی جائے گا جو پنکچر جوڑ دے گا اور ہوا بھر کر آپ کو سائیکل پر لاد کر پہنچائے گا گھر ------!

افوہ! میرا دل چاہا زور زور سے چنگھاڑیں مار مار کر روؤں۔ یا گنواروں کی طرح موٹی موٹی گالیاں دے کر اس کے منہ پر وہی کیچڑ کھینچ ماروں۔ جو میرے

پیروں میں بے طرح لتھڑ گئی تھی۔ مگر پھر شرافت آڑے آ گئی اور میں نے زور سے دانت بھینچ لئے نہ جانے اب بھی اس کی کون سی کل سیدھی رہ گئی اور اس نے دور ہی سے سلیوشن ٹیوب پھینک دیا۔ بدتمیز انسان نے ہوا بھی نہ بھری بیٹھا دیکھتا رہا۔ کس قدر دردناک سماں تھا۔۔۔۔۔ ہوا میں نے خود بھری۔

"آپ کا نام کیا ہے۔ یہ آپ سلیوشن اور پمپ لے جا سکتی ہیں۔ پتہ دے جایئے اپنا۔۔۔۔۔"

"مجھے نہیں چاہئے آپ کا سلیوشن۔۔۔۔۔" میں نے سائیکل کو کوستے ہوئے اٹھایا۔

"اوہو پھر نہیں۔۔۔۔۔"

سامنے سے ایڈنا آتی دکھائی دی۔

"آپ کی سائیکل میں پنکچر نہیں ہوا۔۔۔۔۔" اس نے بناوٹی استعجاب سے بغیر کسی تعارف کے ایڈنا سے پوچھا۔

"نہیں تو۔۔۔۔۔" ایڈنا تیوریاں چڑھا کر بولی۔۔۔۔۔ میں خوش ہوئی کہ اب یہ جنگلی اس کی بھی خبر لے گا۔

"تعجب۔۔۔۔۔" وہ بولا۔

"کیوں۔۔۔۔۔" ایڈنا اکڑی۔

"ان کی سائیکل میں تو ہو گیا۔۔۔۔۔" اس نے طنز سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"جھوٹ۔۔۔۔۔ بالکل تو نئے ٹائر ہیں۔۔۔۔۔" ایڈنا بولی۔

"جی ہاں نئے ٹائروں میں تو اور بھی جلدی ہوتا ہے۔۔۔۔۔" اور وہ قہقہہ لگاتا چلا گیا۔

"سلی۔۔۔۔۔" ایڈنا جل کر بولی۔

میں نے اُسے اُس جنگلی کی ایک بات بھی نہ بتائی۔ اس قابل ہی کب تھی کوئی بات۔۔۔۔۔ اور وہ باتیں ہی اور ہوتی ہیں جنہیں ہم سر جوڑ کر ایک دوسرے

کو بتایا کرتے ہیں۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لٹھ نما حیوان یونیورسٹی میں ریسرچ کے لئے اسی سال آیا تھا۔ نہ جانے کہاں سے؟

"ہلو پنکچر------" وہ کئی دفعہ ملا اور بے تکلفی سے بولا۔ اور پھر ہم اور زیادہ ملنے لگے۔ بہت جلد ہم بے تکلف ہو گئے۔ وہ اکثر آیا کرتا مجھے پہلی دفعہ یہ معلوم ہوا کہ بے لوث کھرا پن۔ چاپلوسی سے کہیں زیادہ دلچسپ ہوتا ہے گو وہ عموماً میری بات کاٹ دیا کرتا تھا لیکن ہم پھر بھی ملتے تھے۔ ایڈنا اس کی صورت سے جلتی تھی کہ "اس جنگلی کو اتوار کا ستیاناس کرنے کو تو کم از کم مت بلایا کرو۔"

میری اس کی ایک گھڑی نہ بنتی تھی جہاں کسی شاعر یا مصنف کی تعریف میرے منہ سے نکلی اور وہ بولا------ "اجی ہٹاؤ کمبخت کو------ میرا بس چلے تو جلوا دوں اسے------"

جہاں کہیں میں نے کسی تقریر کی تعریف کی اور اس نے بکنا شروع کر دیا۔ "لاحول ولاقوۃ کس قدر ذلیل ٹرٹر تھی------ کچھ تھا بھی اس میں۔ میں تو چپ رہا ورنہ------ وہ تو کہو خیر ہوئی۔"

میں ان باتوں سے اس قدر جل جاتی کہ اسے دلائل سے قائل کرنے کی برداشت نہ رہتی۔ مجھے تعجب ہوتا تھا کہ میں اس سے ملتی ہی کیوں ہوں مجھے کسی کی حکومت سہنے کی عادت نہ ہے نہ کبھی ہو۔"

ایک دن تو بدتمیزی کی انتہا ہو گئی اور ایڈنا نے کہا۔

"پارٹی کے دام غارت ہوئے۔"

ہم نے پروفیسروں اور چند نامی لڑکوں کو دعوت دی آپ بھی آئے "بولے تم بھی تو مضمون لکھتی ہو------"

"میں نے کتنی ہی دفعہ کہا------" بھئی سب کے سامنے تم مجھ سے نہ بولا کرو مگر اس نے ایسی بڑی بڑی دھمکیاں دیں کہ مجبوراً" سہہ گئی۔

"ہاں لکھتی ہوں------" میں نے ذرا تکلف سے کہا۔

"کیسے لکھ لیتی ہو مضمون------" اس نے حیرت سے کہا۔

میں چونکی----- مگر سنجیدہ دیکھ کر کوئی شاعرانہ طریقہ سوچنے لگی۔
بولے----- "خیالات دل میں آتے ہوں گے۔"
میں نے سر ہلا دیا۔
"وحی سی آتی ہو گی-----"
"ہاں وحی آتی ہے-----" میں نے انسانیت کے جامہ میں دیکھ کر مسکرا کر کہا۔
"کیسے آتی ہے وحی تم جیسوں کو----- جیسے مرگی کا دورہ پڑتا ہے ویسے ہی؟ پہلے کچھ سردی سی لگتی ہو گی-----" وہ پھر اڑنے لگا مجھ سے۔
"خیالات ہوتے ہیں۔ وہ پھر دماغ میں آ جاتے ہیں-----" ایک اور صاحب بولے انہیں شائد مجھ پر رحم آیا۔
"نہیں جی خیالات وغیرہ کچھ نہیں----- ہمیں نہ آ جائیں خیالات----- یہ تو کوئی اور بات ہے-----"
مکاری سے مسکرایا۔
"کوئی اور بات کیا ہو سکتی ہے۔" ایک پروفیسر نے کہا۔
"یہی کوئی...... اب تو یہ ڈاکٹر سے پوچھا جائے-----" وہ ہنسی چھپانے کو آگے جھک گیا۔
میں اور سارے سننے والے سکتے میں رہ گئے کچھ بد تمیز لوگ ہنس بھی پڑے۔
سب کے جانے کے بعد میں نے لڑنے کی بے انتہا کوشش کی مگر ناکام رہی وہ بضد اس بات پر اڑا رہا کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں خیر اسی میں ہے کہ بجائے فخر کرنے کی فکر کی جائے آثار کچھ اچھے نہیں اور الٹی میں نیم پاگل تو ہو ہی چکی ہوں۔
وہ عموماً مجھے "پنچر" کہا کرتا۔ میں نے بغاوت پر آمادگی ظاہر کی تو مجھے سب کے سامنے پنچر کہنے پر تل گیا----- کہا نا میں نے۔ کہ اس سے تو بحث کرنا بیکار تھا۔ میں بچوں کی طرح چڑ جاتی اور بات اسی سے کی جائے جو انسانیت کے جامے میں ہو۔ خواہ مخواہ کے اعتراضوں سے نہیں ڈرتی۔ پر نہ جانے کیا بات تھی جب وہ کسی

بات پر اعتراض کرتا۔ میرے دل کو جا لگتی اور غیر ارادی طور پر وہ بات ہی پھر مجھ سے نہ کی جاتی۔

دہرانے سے کیا فائدہ------ بس ہم برابر ملتے رہے۔ آپ تعجب کریں گے کہ کیوں میں نے اس جنگلی سے راہ رسم جاری رکھی۔ تو یہ خود نہیں معلوم۔ کمزوری سمجھ لیجئے یا جو جی چاہے آپ کا------ نہ جانے اس میں کیا بات تھی کہ کھینچے لیتی تھی وہی باتیں جو پہلے بدتمیزی معلوم ہوتی تھیں اب بھلی معلوم ہونے لگی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اوپر سے دل سے اسے وحشی اور جنگلی کہنے کے بعد اگر وہ کسی دن نہ آتا اور ایک آدھ جھگڑے کا لطف پیدا نہ ہوتا تو جی نہ لگتا۔ میرا دل خوف سے بیٹھ جاتا۔۔ جب مجھے محسوس ہوتا کہ اس کے بغیر زندگی سونی ہو گی۔ اس کے دل کا حال مجھ سے پوشیدہ تو نہ تھا۔ نتیجہ وہی ہوا جو دو انسانوں کے ملنے سے ہوتا ہے پھر وہ انسان ہوتا جب نا!----- اس کی تو کوئی بات ہی ڈھنگ کی نہ تھی اس کے اظہار الفت کا طریقہ بالکل حضرت آدم کا سا تھا۔

وہ جنگلات میں ایک معمولی عہدے پر مقرر ہو گیا اور اب بجائے روزانہ کے ہفتہ اور اتوار کو ملنا ہوتا------ اس نے بارہا وہاں کی تنہائی کا ذکر کیا۔ مگر جوں ہی میں نے ہمدردی کا اظہار کرنا چاہا۔ تنہائی، سکون اور اطمینان کی زندگی کہہ کر الٹی تعریف کرنی شروع کر دی مجھے اب بھی انتظار تھا۔ نہ جانے کس بات کا ایک دن فرمانے لگے ''تم ہوتیں تو یقیناً پسند کرتیں تیرنے کے لئے بہترین مقام ہے'' اور اس سے آگے کچھ بھی نہیں۔

میں خاموش رہی۔ کئی دفعہ ایسا معلوم ہوا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے اس سے قبل کہ میں خود ہی موقعہ دوں وہ کسی معمولی سی بات پر اس بری طرح اعتراض کرتا کہ میں جل کر توبہ کرتی کہ خدا ہی بچائے۔ اس بلا سے------ مگر ہم عورتوں کی کوئی بات سیاسات سے خالی نہیں ہوتی۔ اگر ہم کسی بات کو کرنا چاہیں تو سیدھے راستے کبھی نہیں چلتے بلکہ گھوم گھوم کر منزل مقصود تک پہنچتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کامیابیاں زیادہ تر عورتوں ہی کو نصیب ہوتی ہیں گو کوئی مانتا نہیں اس بات کو۔

فرض کیجئے کہ آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا چھوٹا سا بھائی ذرا تخت کے نیچے گھس کر اگال دان نکال لائے پردہ ہے کہ شیشے کی گولیوں یا اور کسی غیر دلچسپ کھیل میں منہمک ہے آپ گھُرکتے ہیں------ تو وہ رونے کی دھمکی دیتا ہے۔ ایسے موقعہ پر آپ کیا کریں گے ہم تو یہ کرتے ہیں کہ فوراً کسی دوسرے بچے کو پکارتے ہیں جو گھر میں موجود نہ ہو۔

"بھائی مکھن میاں------ ذرا اگلدان تو اٹھا لاؤ------ وہ------ دیکھو تخت کے نیچے سے اس کا کنارہ چمک رہا ہے۔ شاباش آہا دیکھیں------ آنکھیں میچے۔ کون لائے------ کون لائے۔" اور وہ معصوم رقابت کے جنون میں تیر کی طرح دوڑتا ہے اگلدان آجاتا ہے ------ تو میں نے بھی منظور صاحب کو آلہ کار بنایا بڑی شرم کی بات ہے' پر آپ ہی بتایئے اور کیا کرتی؟

اگر میں اس سے بے حیائی لاد کر کہہ دیتی------ "آؤ ہم تم شادی کر لیں نابکار تم وہاں تنہا اور میں یہاں------ تو وہ یقیناً بھڑک اٹھتا۔ مجھے معلوم تھا وہ مر جائے گا مگر منہ سے کبھی کچھ نہ کہے گا۔ اس سلسلہ میں خدا معاف کرے منظور کی نئی موٹر میں بڑی سیریں کیں اور یہ دستور ہو گیا کہ میرا وحشی دوست تو چھٹی لے کر آئے اور میں ٹال دوں------

"معاف کرنا' منظور نے آج پکچر جانے کا وعدہ کیا ہے بہت عمدہ پکچر ہے------" اور وہ اپنا سا منہ لے کر چلا جاتا------ میرا دل کٹ جاتا اور پکچر دھندلی دکھائی دیتی------ منظور خدا کرے اسے بہت اچھی بیوی ملے اس غیر معمولی عنایت سے ذرا بھی حیران نہ ہوا۔ نئی نوکری نے شادی کے بازار میں ان کی چوگنی قیمت کر دی تھی۔

مگر اللہ رے جنگلی پن------ رقابت اپنا کام کئے بغیر نہ رہتی اور وہ تلملا اٹھتا' بل کھاتا------ مگر کیا مجال جو ٹس سے مس ہو جائے۔ اور ہی علاج کیا۔ یعنی آنا ہی چھوڑ دیا------ اور مجھے پھر وہی اندھیری شکست کے ہولناک خیالات نے گھیر لیا۔ شکست اور زندگی کے اس خاص شعبے میں ہے------ یہ سمجھئے کہ زندگی کے

ٹائرمیں پنکچر شکست کا بدلہ جل کر مکمل شکست کھا لینا ہی ہم لوگوں کے بس کی بات ہوتی ہے۔ نہ جانے انتقاماً یا خود کو سزا دینے کے لئے۔ میں نے منظور کی انگوٹھی پہن لی۔ ذرا ڈھیلی تھی------ اور گر گر پڑتی تھی------ پر میں نے آگے ایک تنگ چھلا پہن کر اسے روکے ہی رکھا۔

میں نے اپنے اوپر ایک قسم کی ڈھٹائی سی لاد لی تھی۔ جلدی جلدی تیاریاں کرنا شروع کیں ارادہ ہوا کہ فوراً ہی کشمیر چل دیں گے۔ منظور کی غیر موجودگی میں مجھ پر جنونی کیفیت طاری ہو جاتی------ دل بغاوت پر تل جاتا------ اور یہ محسوس ہوتا کہ اگر فوراً شادی نہ ہوئی۔ تو ضرور پاگل ہو جاؤں گی۔ مجھے خود پر ذرا بھی بھروسہ نہ رہا تھا۔ بعض وقت تو ان باغیانہ خیالات پر خود کو سزا دینے کے لئے منظور پر ضرورت سے زیادہ عنایات کی بارش کی جاتی' پر کون جانے وہ سارا اظہار اور لگاوٹ دل میں کسی کا خیال لے کر کہا جاتا------ خدا ستار عیوب ہے منظور کو کیا معلوم کہ اس کی حیثیت ایک ڈمی کی سی تھی۔ جبکہ دل کہیں اور ہوتا تھا۔ نہ جانے ہندوستان میں کتنی عورتیں اپنے شوہر کے گلے میں بانہیں ڈالتے وقت کس کے خیال میں کھوئی ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں سچی محبت بھلاوے نہیں بھولتی زخم بھر جاتا ہے پر جہاں پوربیہ ہوا چلی اور ٹیسیں اٹھنا شروع ہوئیں پر آج کل تعجب ہے مصنوعی ناک کان مل جاتے ہیں تو سکون قلب کیوں نہیں مل سکتا؟

یہ ناممکن ہے ضرور ملتا ہے------ تلاش کرنے والا چاہئے۔

شام کے وقت درزی کو رخصت کر کے اندھیرے ہی میں خاموش ایک کرسی پر لیٹی رہی------ کس قدر اداسی سی تھی------ معلوم ہوتا تھا ہوا میں ہزاروں زہریلی گیسیں پھیلی ہوئی ہیں۔ کلیجہ میں عجیب قسم کی سوزش ہو رہی تھی کہ اگر بہت ضبط کیا تو سینے میں کوئی چیز زور سے پھٹ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی منظور' میرا خیال ان کی طرف گیا۔ انہیں میں گیس ماسک کی طرح استعمال کر کے ہمیشہ ان گیسوں سے بچ جایا کرتی تھی۔

برآمدے میں آہٹ ہوئی منظور کے آنے پر مجھے ہمیشہ بن کر چونکنا پڑتا تھا

اور اس وقت تو میں نیم مردہ ہو رہی تھی۔ ایک لمبا چوڑا سایہ کمرے کے دروازے پر نظر پڑا۔ وہ کچھ آشنا سی بالوں کی تراش خاص جھکاؤ لئے شانے اور باہر کی روشنی میں پتھر کی ترشی ہوئی مورتی کا سا کرخت چہرہ دل تڑپ تڑپ کر اچھلنے لگا اور مجھے پورا یقین نہ ہوتا کہ یہ ظالم مجھے خون تھکوا دے گا۔ تو چیخیں مار کر اس بے رحم سے چمٹ جاتی۔ تین ہفتوں بعد آج مرنے کی فرصت ملی تھی۔ مگر منظور کی متبرک انگوٹھی گیلری کی دھندلی روشنی میں جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔

میرا دل ڈوبنے لگا۔

"ارے کس قدر اندھیرا ہے-----" اندر آکر کہا۔

"کہیں تار بگڑ گیا ہے-----" میں نے چاہا وہ بجلی نہ جلائے ورنہ میرے منحوس چہرے پر جو ٹھیکرے ٹوٹ رہے ہیں وہ کیسے چھپیں گے۔"

"کہاں خراب ہے یوں ہی بھئی-----" میز کا لیمپ جلا کر ریڈیو کے سامنے اسٹول پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر خاموشی سے ریڈیو کو مروڑتے رہے' کھڑ کھڑ' شر شر کھر۔ میرے آنسو نکل آئے۔

میں نے نئے جائے تقرر کی بابت پوچھا۔

"کیسی جگہ ہے؟"

"دوزخ" گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"کیوں-----؟ جنگل تو پر فضا ہوتے ہیں-----" میں نے کہا۔

"ہوں۔ شاعروں کے لئے۔"

"یا اللہ کدھر سجدہ کروں۔ یہ تغیر-----"

"نہیں درندوں کے لئے بھی-----" میں نے جواب دیا۔ پھر پچھتانے لگی کہ میرا تو ارادہ ہی بے تکلف ہونے کا نہ تھا۔

"ہوں----- مگر پالتو درندوں کے لئے نہیں----- جو پنجرے کے عادی ہو چکے ہوں-----"

آواز کی نرمی مجھے متحیر کئے بغیر نہ رہ سکی۔

"مگر آپ کو تو تنہائی پسند ہے----- شکار تو خوب ہوتا ہو گا۔"

"خاک-----" ذرا جلی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیوں----- عباس، شہاب نہ جانے کون کون تھے، ان کا ذکر آپ مزے لے کر کرتے تھے۔"

"وہ----- عباس اپنی بیوی کو لے آیا----- شہاب کی ستمبر میں شادی ہو گئی محمود دوڑ دوڑ کر دہلی جاتا رہتا ہے۔ ضیاء کو تو جانتی ہو جنونی ٹھہرے۔"

یہ اس طرح کہا جیسے کوئی بچہ جس کے سارے کھلونے ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے ہوں اور ماں نئے کھلونے منگانے سے انکار کر دے۔

میرے حلق میں سوکھا سا پھندا پڑنے لگا۔

"چھٹیاں ہیں-----"

"نہیں تو لے کر آیا ہوں-----"

"کیوں-----؟"

"ایک ضروری کام تھا-----"

"آپ کو اور کام-----؟ دہلی گئے ہوتے تو قریب پڑتا-----" میں نے تنگ کرنا شروع کیا۔

"ہاں----- وہ----- میں نے اسٹیشن پر اخبار دیکھا تھا مبارک باد دینا تو بھول ہی گیا۔" کھسیانی ہنسی۔

"اوہو تو اس لئے آئے ہوں گے آپ۔ شکریہ----- منظور سے تو آپ کو ہمدردی ہو گی نا-----"

"ہا ہا----- خود کردہ را علاج نیست----- کس نے کہا تھا اس سے کہ دریا میں کودو۔ اب کودا ہے تو ہاتھ پاؤں مارے-----"

وہ کریہہ قہقہہ جسے سن کر مجھے ہسٹریا کا دورہ پڑنے لگتا ہے اپنے مخصوص جھکولوں کے ساتھ گونجا۔ مگر میں نے ضبط کیا۔

"مارچ میں شادی ہو جائے گی۔ سیدھے کشمیر لے جائیں گے۔ وہاں برف،

میں نے مصنوعی مسرت سے کہا۔ گو دل پر برف کے تودے جمے ہوئے تھے۔
"مگر منظور تو تمہیں پسند نہ تھے۔" وہ ایک دم بولے۔
"اوہ۔۔۔۔۔ وہ میری غلطی تھی۔۔۔۔۔ وہ فرشتہ ہیں۔۔۔۔۔ میں نے کم از کم آخری لفظ تو دل سے کہے۔
"ہاں۔۔۔۔۔ ہے تو۔۔۔۔۔ پر کتنا فرشتہ۔۔۔۔۔" اور پھر وہی پاگل کن قہقہہ بڑی جلدی فیصلہ کر لیتی ہو۔"
"ہاں ناقص العقل جو ٹھہرے ہم لوگ۔ خیر منظور جانتے ہیں وہ میری غلطیوں سے بھی پیار رکھتے ہیں۔۔۔۔۔"
"بڑے عقلمند ہیں پھر تو۔۔۔۔۔" ایسے طعن سے کہا کہ میرا جی چاہا منہ نوچ لوں بیوقوف کا۔۔۔۔۔"
مگر میں بولے گئی۔ "وہ فرشتہ ہیں۔۔۔۔۔ میں نے تو ان سے کہہ دیا تھا یہاں تک کہہ دیا تھا۔۔۔۔۔"
"کیا کہہ دیا تھا۔۔۔۔۔" وہ ریڈیو پر دور کا کوئی اسٹیشن لگا کر بولے۔
شکر تھا کہ لیمپ ذرا آڑ میں تھا۔ اور مجھے تاریکی نے اپنی پناہ میں لے رکھا تھا۔ میرا جیتی ذرا آگے کو جھکا۔۔۔۔۔ اسٹول پر بیٹھا تھا بے ترتیب بال۔ باغیانہ ڈھٹائی سے پیشانی کی طرف جھکے ہوئے تھے چوڑے شانے لیمپ کی روشنی سے میرے چہرے کو چھپائے ہوئے تھے ہونٹوں پر وہی کچھ تلخ سی! مسکراہٹ۔ میرا دل بری طرح گھبرانے لگا۔ میں نے بمشکل اس سکی کو روکا جو میرے ہونٹوں پر مچل رہی تھی ریڈیو کی آواز اونچی کرنے کے لئے میں نے ہاتھ بڑھایا اور ادھر سے انہوں نے تھوڑی دیر کے لئے میری انگلی ان کے گرم ہاتھوں سے مس ہو گئی۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ریڈیو لیک کر رہا ہے' میری آنکھوں میں تارے ناچنے لگے اور منظور کی انگوٹھی اس کی گرمی سے پگھلتی ہوئی معلوم ہوئی مگر میں نے سختی سے اس ایکٹر کی طرح شروع کیا جو اپنا پارٹ شروع ہی سے بھول چکا ہو اور ہال میں بد تمیز دو آنے والے تماشائی تالیاں بجانے آئے ہوں۔۔۔۔۔"

کچھ بھی ہو------ انہوں نے تو یہ تک کہہ دیا------ میں نے جب کہا کہ میرا کیا بھروسہ------ شادی کے بعد ہی بدل جاؤں گا اور چل دوں گھر بار چھوڑ کے------ تو وہ بولے------"

"کیا بولے------؟" انہوں نے سکون سے کہا۔ اور لاپرواہی سے سگریٹ تلاش کرنے کے لئے جیبیں ٹٹولنا شروع کر دیں۔

"اوہ------ منظور فرشتہ ہے------" اس نے کہا------ "تم چلی جانا میں بچوں کو پال لوں گا۔ میرے گلے میں آواز اٹک گئی۔

"ہیں------ کیا------ ؟ کیا کہا------ پھر تم نے کیا کہا------ خواہ مخواہ میرا دل دکھانے کے لئے حیرت کا اظہار کرنا اس کی خصلت میں داخل ہے۔

"پھر کیا------ مجھے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ اس وقت منظور پر پیار آیا------ اور------"

"کیا تمہیں پیار آیا------؟"

"اور کیا------ وہ ہے ہی پرستش کے قابل اور کیا کرتی------"

"تم نے اسے گھر سے نکلوا دیا ہوتا------ لاحول ولا قوۃ------"

"کیوں------؟"

وہ تھوڑی دیر حیرت سے منہ پھاڑے بیٹھا رہا۔ کمبخت کی شکل باوجود ان باتوں کے کس قدر جاذب نظر تھی اس نے اپنا اسٹول میرے بالکل قریب گھسیٹ لیا۔ لیکن میں صوفے کے آخر کونے پر کھسک گئی۔ او خدا میں خود کو کس قدر محفوظ سمجھ کر اور سکون سے بیٹھی تھی تین ہفتے تین صدیوں کی طرح کٹے تھے------ پر گزر تو چکے تھے اور اب جب میں نے اپنی پناہ کی جگہ ڈھونڈلی تو یہ پھر مجھے بہکانے آ گیا------ شیطان سانپ کا بھیس بدل کر حوا کو بہکانے آیا تھا۔ اور پھر وہ میں نے خود کو ہوش میں لانے کے لئے زور سے اپنی ران میں چٹکی بھر لی اور دانت بھینچ لئے------

"تم عورت ہو------" وہ سختی سے بولا۔

"یقیناً----" میں نے وثوق سے کہا۔

"اور پھر تم مجھ سے پوچھتی ہو---- کہ کیوں----"

"یہ کوئی بات نہیں ہوئی---- تمہاری دلیل بالکل فضول ہے۔"

"کیا تم واقعی اسے پسند کرتی ہو----؟ میرا مطلب ہے منظور کو۔" وہ ایک دم بولے۔

"کس قدر واہیات سوال ہے----؟ میں نے حقارت سے کہا "اور----"

"مگر---- میں سوچتا ہوں----" اس نے اپنا ہاتھ صوفہ پر پھیرتے ہوئے کہا۔

"کیا سوچتے ہیں آپ----" میں نے رکھائی سے کہا۔

وہ اور بھی قریب آگیا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میں سوچتا ہوں----" آواز میں کسی قدر نرمی تھی---- "میں یہ کہنے آیا تھا کہ میں غلطی پر تھا---- جنگل بڑے بھیانک ہوتے ہیں۔ خصوصاً تنہائی میں---- سنو تو----" مجھے بولنے سے روک دیا---- "میں تنہائی نہیں پسند کرتا---- اب پسند نہیں کرتا---- سنو تو میرا وہاں بہت دل گھبراتا ہے۔"

"ہوں----" میں نے بالکل ان ہی کی طرح لاپروائی سے کہا۔

"میں---- دیکھو بچے وچے کچھ نہیں پالوں گا۔ اگر تم ان کو چھوڑ کر چلی گئیں تو انہیں روز پلوں کی طرح پیٹوں گا۔ اور پھر بھنا اٹھا۔

میں بمشکل اپنی ہنسی گھونٹ سکی۔

"اور یہ ناممکن کہ تم مجھے چھوڑ کر جا سکو۔"

"کیوں---- یہ کیوں----" میں نے کہا۔

"یہ کیوں کہ---- کہ---- میں---- چھوڑو بھی اس بات کو---- لاحول ولاقوۃ---- ایک دفعہ مجھ سے شادی کرنے کے

بعد-----"

وہ بالکل قریب جھک گیا۔

"کون بے وقوف تم سے شادی کر رہا ہے----- ذرا ہوش میں-----" میں نے پیچھے سرک کر کہا۔

"تم سنتی تو ہو نہیں----- میرا دل وہاں بہت گھبراتا ہے اور میں-----" اور پھر بچوں کی طرح کہا۔

"تو میں کیا کروں۔ بلا سے گھبرائے آپ کا دل----- جی ہاں مجھے کیا-----"

"بڑی خوبصورت جگہ ہے کہ تم کہو گی کہ بس جنت ہے" سرور سے آنکھیں نیم باز کر کے کہا۔

"بس معاف رکھئے اپنی جنت سے-----" میری آواز کمزور تھی۔

"ہیں----- ایک بات سنو-----" انہوں نے اپنا دہکتا ہوا گرم ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھا۔

"ہاں----- کیا-----؟" میں نے کہا اور سنسنی آنے لگی ہلکی ہلکی کمزوری بڑھنا شروع ہوئی۔

"تم سب کچھ سمجھتی ہو----- کیوں ہے نا----- پر بنتی ہو-----" وہ اور آگے جھکے صوفہ پر پیچھے سرکنے کی جگہ بھی تو نہ تھی۔

"اونہ----- بھئی-----" میں نے صدائے احتجاج بلند کی مگر ایک تھکے ہوئے بچے کی طرح انہوں نے میری گود میں سر ڈال دیا اس وقت۔

"گھر گھر پھٹ شوں فش-----" باہر برآمدے میں موٹر بھنا رہی تھی۔

"ارے پنکچر-----" منظور کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی اور ہم چوروں کی طرح ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

❀❀❀

اس کے خواب

جہاں بھی ہو، سوتا ہو یا جاگتا، خواب برابر آتے رہے ہیں۔ مزید ارچٹ پٹے، پھیکے، میٹھے دھندلے، روشن اور کبھی بالکل ہی نظر نہ آنے والے خواب کسے نہیں آتے؟ اور وہ تو اب جوان تھا۔ وہ جب ہی جوان ہو گیا تھا جب مہترانی کی جوان بہو اسے پرستان کی پری معلوم ہونے لگی تھی۔ اور اس کی چیپڑ بھری پیلی آنکھیں نرگس مستانہ اور بدبو دار ہونٹ معنبر نظر آنے لگے تھے۔ جب وہ اپنی پتلی کمر جو ٹھوس اور پتھریلی آنکھوں کے لئے بھینس جیسی نظر آنے لگی تھی، مچکاتی چلتی تو سینکڑوں مہتروں کا تو ذکر کیا۔ خود گوشت والے حاجی جی کا چھوٹا سالا۔ بندو کا بدمعاش بھتیجا اور نہ جانے کون کون مچھلیوں کی طرح بلبلانے لگتے۔ اور دھوبن کا تو کہنا ہی کیا۔ اس کی گندمی رنگت اور پھیلی ہوئی ناک، اس کی شاعرانہ نظروں کے تیر، اور جب سڑاند اور بھکراند سے بسے ہوئے چیتھڑوں کا پوٹلا لے کر ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی گلی میں پڑی ہوئی نجاست سے ایڑیاں بچاتی نکلتی تو نہ جانے کتنے جی لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

مگر ہاں وہ بھی نوجوان تھا اور پھر شاعرانہ طبیعت۔ نہ جانے یہ اللہ میاں شاعروں سے کیوں جلتے ہیں۔ ہزار بیچارا انہیں کی حمد و ثنا میں جتا رہتا ہے۔ مگر وہ ہیں کہ اس سے جان بوجھ کر روٹھتے ہیں آخر کیوں؟ سب کچھ پڑھن لکھنے کے بعد بھی اسے نوکری کیوں نہیں ملتی؟ ہونہہ! جیسے اسے نوکری کی پروا ہے۔ یہ اور بات تھی کہ وہ لوگوں کے زور دینے پر آئی۔ سی۔ ایس، پی۔ سی، ایس اور نہ جانے کتنے "ایسوں" کے امتحان میں شریک ہوا۔ مگر شکر ہے کہ وہ فیل ہو گیا۔ ورنہ قومی اور

ادبی خدمت جس کے لئے وہ بنایا گیا تھا' کس طرح کر سکتا تھا؟ اب تو وہ صرف ایک پرائیویٹ اسکول میں عیوضی پوری کر رہا تھا۔ چونکہ دو سال سے وہ برابر عیوضی پوری کر رہاتھا۔ اس لئے اس کی ترقی کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ پر خواب کہیں پیسوں سے تھوڑی دیکھے جاتے ہیں۔ پیسہ کوئی دوربین تو ہے نہیں کہ آنکھ سے لگایا اور دور دور کی چیزیں دکھائی دینے لگیں۔ خواب دیکھنا تو مفت کا معاملہ ہے۔ وہ مزے سے چارپائی پر لیٹ جاتا۔ کہنی کا مثلث بنا کر آنکھوں پر کھڑا کر لیتا۔ اس کا ایک پیر خود بخود دوسرے پیر پر چڑھ جاتا اور یہ آسن اسے سپنوں کی نگری میں پہونچا دیتا۔ وہ کتنی باتیں دیکھا کرتا! اس کا پرانا پلنگ اور گھٹا ہوا کمرہ جادو کے زور سے اڑ جاتے اور وہ اپنے کو ایک عجیب و غریب جنگل میں پاتا۔ جہاں ایک ضعیف سادھو بھگوان سے دھیان لگائے ہوتا۔ یقین کیجئے سادھو کبھی اکیلے نہیں ہوتے۔ ان کے ایک لڑکی ضرور ہوتی ہے جس کی ماں نہیں ہوتی۔ اگر ماں ہو تو پھر مزہ ہی کیا۔ کم بخت سانپ کی طرح اس کے چاروں طرف کنڈلی مارے بیٹھی رہے گی۔ اور پھر سادھو اور اس کی لڑکی کا ہونا بالکل فضول ہے۔ خواہ جنگل کتنا ہی حسین اور سریلا کیوں نہ ہو۔ ہاں اور یہ لازمی ہے کہ وہ لڑکی حسین ہو بے انتہا حسین۔ بھلا سادھو کی لڑکی جنگل میں دریا کنارے کنول توڑ رہی ہو اور سیاہ' کھتری اور چپٹی ہو تو بے اختیار یہی جی چاہے گا کہ چڑیل کو پانی میں ڈبو دو۔ خیر تو اس کے جنگل کے سادھو کی بھی حسین لڑکی ہوتی۔ اب یا تو وہ گھوڑے پر سے گر پڑتا اور وہ لڑکی اس کا سر زانو پر رکھ کر ہوش میں لاتی یا پھر وہ پیاسا ہوتا اور کٹی میں جاتا اور سادھو اپنی حسین منورما' آشا' یا روپا جو کچھ بھی ہوتی اسے پکارتا اور وہ بجلیاں گراتی' آنچل کے شعبدے دکھاتی آتی اور لٹیا یا گلاس میں تازہ بکریوں کا دودھ دوہ کر لاتی۔ شرمانا اس کے لئے اشد ضروری ہوتا۔ اور اس کے جسم میں بجلی کوندانے کو اس کی پتلی انگلیاں شرطیہ طور پر چھو جائیں اور جب یہ معاملہ ہو تو انجام معلوم ہی ہے۔ وہ دودھ پی کر تازہ ہو جاتا۔ سادھو کی یا تو ٹانگ ٹوٹی ہوتی یا اندھا ہوتا۔ یا اور کوئی بات ہوتی اور وہ دونوں اکیلے سارا سارا دن ندی پر کھیلتے۔ وہ اس وقت یہ بالکل بھول جاتا کہ اتنے دن اسکول میں

عیوضی کون کرے گا۔ اور لڑکوں لو الر معلوم پڑ جائے کہ "ماٹ صاحب" ندی کے کنارے راس رچانے جاتے ہیں تو پھر تو وہ اسے جیتا نگل لیں۔ اور جو ذرا بہت ہیڈ ماسٹر کے داب سے پڑھ لیتے ہیں۔ وہ بھی بند کر دیں اور لڑکوں کا خیال آتے ہی کیسا بھی مست کن خواب ہو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جاتا۔ وہ لڑکوں کو کوستا۔ کاش ان سب کی مائیں بانجھ ہوتیں یا بچپن میں بیوہ ہو جاتیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لوگ بیواؤں کی شادی پر کیوں مصر ہیں۔ اگر چند مشینیں اتنی تیزی سے کام نہ کرتیں تو آج کو ایک ایک کلاس میں تین تین سیکشن نہ ہوتے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر دنیا میں اتنے ننگے بھوکے کیوں ہوں کہ سڑک پر چلو تو کندھے سوج جائیں۔ ریل میں سوار ہو تو اکڑوں سوؤ۔ سینما میں جاؤ تو سانس نہ لی جائے۔

مگر ابھی تو کافی وقت تھا اور وہ کروٹ بدل کر پھر اسی دنیا میں ڈوب جاتا لیکن کروٹ کے ساتھ اس کی دنیا بھی کروٹ لیتی۔ سامنے لٹکی ہوئی تصویر پر اس کی نگاہ جم جاتی۔ یہ تصویر ٹیگور کی تھی، جو اس کی بہن نے شادی ہونے سے پہلے لگائی تھی۔ اور اب اس کے جانے کے بعد بھی ویسی ہی لٹکی ہوئی تھی۔ وہ نویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ ٹیگور کی نظمیں پڑھ پڑھ کر وہ بالکل اس پر دیوانی ہو گئی تھی۔ وہ کس طرح ان کی پوجا کیا کرتی تھی، اس نے انہیں اپنا دیوتا مان رکھا تھا۔ اوہ کاش وہ بھی کوئی شاعر یا مضمون نگار ہوتا تب؟ تب تو ضرور کوئی اس کی بھی اسی طرح پوجا کرتا، وہ تھوڑی دیر میں سچ مچ خود کو ٹیگور یا کوئی بڑا اور مشہور شاعر سمجھنے لگتا۔ ہر لڑکی کے کمرے میں اسے اپنی تصویر لٹکی نظر آتی جس میں داڑھی نہ ہوتی مگر آنکھیں اس کی اپنی آنکھوں سے آٹھ گنی خوبصورت اور بڑی ہوتیں۔ خمار، سیاہ کاکلیں، مرمریں گردن پر رقص کرتیں۔ اور پیشانی ہیرے کی طرح دمکتی افسوس اس کی اپنی گردن کھردری اور دھوپ سے جلی ہوئی تھی۔ اور قبل از وقت بال جھڑنے پر آمادہ تھے۔ مگر کوئی پروا نہیں۔ خواب میں ان باتوں کا جھگڑا نہیں ہوتا۔ بس تو ہزاروں لڑکیاں جو لازمی طور پر حسین اور جوان ہوتیں انھی پر مرجاتیں۔ پلندے کے پلندے ڈاک سے خطوں کے آتے۔ کمرہ پھولوں کے تحفوں سے بھر جاتا۔ اور

وہ ان کے عشق سے تنگ آ جاتا۔ مگر ان میں سے سب سے زیادہ حسین، امیر اور جوان اس کا کہیں بھی پیچھا نہ چھوڑتی، وہ تو اس پر جان فدا کرتی۔ اور وہ کھنچتا۔ وہ لپٹتی یہ بھاگتا، وہ ندیدی بلی کی طرح اس کے چاروں طرف گھومتی۔ پر وہ گیانی سادھو کی طرح اسے دھتکارتا۔ وہ اس کی یاد میں تڑپتی یہ اسے بھول جاتا اس کے ماں باپ، بہن، بھائی، کنبے، رشتے والے اسے ملامت کرتے۔ مگر وہ سب کچھ تج کر اسی سے چمٹتی......

"پران ناتھ مجھے اپنے چرنوں میں جگہ دو۔"

"دنیا کیا کہے گی۔"

"میری دنیا تو تم ہو۔"

اس کا دل پگھلتا جاتا۔ اوہ...... مگر عین اسی وقت دھوبن دروازہ کوٹتی۔ دھوبن سنہرے مکھڑے والی لچکتی ہوئی...... وہ اپنے کو گھاٹ پر پاتا۔ چھوا چھو رنگیلی دھوبن چندریاں دھوتی ہوتی...... اس کی کنول جیسی آنکھیں پریم ساگر میں ڈولتیں۔ اس کا دل کلبلانے لگتا۔ جیسے کوئی آساوری گا رہا ہو اور گاتے گاتے کومل رے لگا دے۔

اور یکایک دھوبن کے گھر والوں سے لڑنے کی گرج سنائی دیتی ہے۔ بجائے سریلی دھوبن کے اس کی بھینگی ساس، جب بہت سے کپڑے کھو جاتے ہیں تو ہمیشہ یہی بھینگی ساس کپڑے لے کر آتی ہے۔ تاکہ کوئی اس سے کپڑوں کے کھونے پر بازپرس کرے تو خوب دنگا مچائے۔ دام کاٹنے نہ دے بلکہ اتنا لڑے کہ سارا گھر پست ہو کر پاگل ہو جائے۔ اس نے آنکھیں میچ لیں اور لرز اٹھا کہ اب دو چار گھنٹے دھوبن کے معرکہ میں گئے۔

جب وہ شاعر پرست لڑکیوں سے گھبرا اٹھتا تو اسے ارمان ہوتا کہ کاش کسی کا کوئی حادثہ ہی ہو یا موٹر لڑے یا طوفان آئے۔ اندھیری رات میں وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر کسی امیر اور حسین لڑکی کو موت کے پنجوں سے بچائے۔ لڑکی تو خیر شرما کر آنچل ڈھلکا لے مگر امیر آدمی (جس کے کوئی دوسری اولاد نہ ہونا چاہئے اسے موٹر

میں لے جائے اور تخیل میں وہ موٹر کی سرسراہٹ سنتا اور پہلو میں حسین لڑکی کا کانپنا محسوس کرتا' ایک عالی شان کوٹھی کے رئیسانہ ڈرائینگ روم میں وہ اس کا شکریہ ادا کر کے چھوڑ کر چلا جاتا۔ پر وہ لڑکی کو چھوڑ کر جاتا اور خود فوراً یا تو ضروری کام میں لگ جاتا یا فوراً بیمار پڑ جاتا۔

اب وہ حسین لڑکی اسے پر تکلف چائے میں پیش کرتی اور شرمائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی تو اس کی ہستی کے تار جھنجھنا اٹھتے۔ سادھو کی لڑکی اس وقت اسے اس قدر بھدی لگتی کہ کیا بتایئے اسے اپنے اس قدر فرسودہ خیال ہونے کا یقین ہی نہ آتا کہ وہ ایک جنگلی لڑکی سے محبت کر سکتا تھا۔ سادھو والی لڑکی اسے پھوہڑ اور سڑیلی سی معلوم ہوتی۔ دودھ لٹیا میں لئے چلی آ رہی ہے۔ پیاس لگی ہو تو چائے پلانی چاہیئے نہ کہ نیکھڑا اچھلا نڈا بکریوں کا دودھ کہ ابکائی آ جائے اور لٹیا سے کوئی دودھ پئے تو کیسے پئے سارا باچھوں میں سے بہہ جاتا ہے۔ چائے سے اس کا دماغ کھل گیا۔

اب محبت نہ ہوتی تو امیر آدمی کی لڑکی ہی کیوں پیدا ہوتی۔ لہٰذا وہ تو ہوئی ہی۔ اب دو باتیں ہوتیں۔ یا تو امیر آدمی فوراً اسے گھر داماد بنا لیتا اور دونوں ہنسی خوشی رہنے سہنے لگتے۔ یا اگر کوئی جناتی بڈھا ہوتا تو اودھم مچاتا۔ بڈھے کے اودھم مچانے کے خیال سے ہی اس کے خواب پھسلنا شروع ہو جاتے اور سب تتر بتر ہو جاتے۔ اسے یاد آ جاتا کہ شادی وادی میں اس کی کچھ نہیں ہو رہی ہے بلکہ شام کو اسے ڈبل ڈیوٹی بجانے پھر اسکول جانا ہے۔

وہ امتحان دیتے ہوئے لڑکوں کی قطار میں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر گھڑی کے پینڈلم کی طرح گھومتا۔ لڑکے سر جھکائے کاغذ گودنے میں تندہی سے جُٹے ہوتے۔ گویا بڑا اہم کام کر رہے ہیں۔ مگر وہ خوب جانتا ہے کہ امتحان دینے کے بعد یہ لڑکے بھی اسی طرح گھڑی کے زنگیائے پرزوں کی طرح ایڑیاں رگڑیں گے۔ کاغذ کتنا مہنگا ہوتا جا رہا ہے۔ اگر سوچ سمجھ کر کام کیا جائے تو...... خیر اس میں اس کا کیا دخل تھا؟

ٹہلتے ٹہلتے وہ پھر اونگھ جاتا...... اس کا دماغ سویا کرتا۔ مگر ٹانگیں برابر آگے پیچھے کھسکتی رہتیں۔ گھر پر جو بڈھے امیر سے وہ لڑائی کو ادھ بیچ میں چھوڑ آیا تھا۔ اسے پھر جوڑ توڑ کر شروع کرتا۔ لیکن اس کنجوس خبیث سے لڑنا اسے قطعی نہ بھاتا اور وہ فوراً ہی رخ بدل کر کوئی دوسری ترکیب سوچنے لگتا۔ اس مرتبہ اس کے خوابوں کی رانی کبھی تو ریل کے کمپارٹمنٹ میں مسافروں کے چلے جانے کے بعد مسکرا مسکرا کر ایک نیا قصہ شروع کر دیتی یا سڑک کے نکڑ پر سنسان گلی میں اس کی سائیکل سے ٹکرا جاتی۔ یا اپنے شان دار موٹر سے اسے کچل کر گھر اٹھا لے جاتی۔ یا کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ بے ہوش ہو کر اس کی آغوش میں آن پڑتی اور پھر؟...... پھر وہی بات۔

وہ جہاں جاتا...... جدھر دیکھتا ایک نہ ایک لڑکی ضرور اس کے کام میں ٹانگ اڑا دیتی۔ جھلا اٹھتا' بھن جاتا۔ آخر یہ ذلیل کمینی' بے وقوف ہستی' شیطان کی طرح اس کے پیچھے کیوں لگی ہوئی تھی۔ دنیا کے ہر معاملہ میں گھسی پڑتی ہے اور خواہ مخواہ اودھم مچاتی ہے۔ کم بخت کو چار دیواری میں بند کرو۔ بیڑیاں ڈالو پر چھلاوے کی طرح ہر جگہ موجود...... اوہ مگر کہاں؟ موجود تو تھیں۔ مگر اس سے کتنی دور' ماں نے کتنی ہی لڑکیاں ڈھونڈیں پر سب چڑیلیں' بھونڈی' چپٹی' نکٹی خاندان بھر میں ایک بھی ڈھنگ کی نہ تھی۔ ہندوستان میں سیاہ رنگت نے تو اور بھی لٹیا ڈبو دی۔ ادھر کے ملکوں میں بلا سے رنگت تو ہے۔ یہ نہیں کہ کالی کالی چھپکلیاں سی۔ دیکھو تو دل لوٹ جائے۔ اس کے خیالات فوراً بدل جاتے اور اسے سادھو کی لڑکی کے چہرے پر گہرے گہرے داغ دکھائی دینے لگتے۔ وہ امتحان دیتے ہوئے لڑکوں کی شکلیں گھورتا۔ اندازاً" سب کی بہنیں اسے بھونڈی نظر آتیں۔ کم بخت کیا بری شکلوں کے تھے۔ بنواری کی ناک پر تو جی چاہتا گھونسہ مار دے۔ خصوصاً" جب وہ جو میٹری سمجھاتے وقت اپنا پورا دھیان کھڑکی سے باہر خوش مذاق کتوں کی طرف لگا دیتا دہنو کم بخت بھینگا' بھویں تکونی...... دانت سڑے ہوئے۔ سروپ کے خیال ہی سے وہ جل اٹھتا۔ لوگ کہتے ہیں بچوں کو پیار سے بٹھاؤ۔ چاہے جی چاہتا ہو کہ سب

کو زندہ جلا دیں۔ مگر پیار کروایا جا رہا ہے۔ خوب! بنتی ہو جانو۔

کونے میں بیٹھی ہوئی مرہٹی لڑکی کو دیکھ کر وہ اور بھی تنگ ہوتا۔ اس کے نخرے یہ نرالے زیادہ سے زیادہ بارہ چودہ برس کی۔ پر وہ کلاس میں ایسی رکھی جاتی تھی جسے روئی کا پھویا۔ الگ ایک کونے میں اینٹھی ہوئی۔ غرور سے پیٹھ اکڑائے ڈٹی رہتی۔ یہ فتنی نہ جانے کتنے دل جلوں کو ہیڈ ماسٹر صاحب سے ٹھکوا چکی تھی۔ ذرا کوئی بولا اور انڈوں پر بیٹھی مرغی کی طرح کڑکڑاتی۔ خود ماسٹر ہو کر اس سے ڈرتا تھا۔ اور ویسے اس میں دھرا کیا تھا۔ ذرا سی چھوکری۔ کون منہ لگے۔ مگر جب بھی اس کی طرف دیکھو۔ معلوم ہوتا کہہ رہی ہے "کہہ دوں ماسٹر صاحب سے؟" کبھی وہ اسکول میں کام کر کے نہ لاتی تو کیا مجال جو کوئی اس سے پوچھ سکے کہ تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں؟ وہ نخریہ بھول جانے کا عذر کر کے صاف بچ جاتی۔ اس کا دل چاہتا کہ ایک کوڑا لے کر مردار کو اتنا مارے کہ بے ہوش کر دے اور جو کچھ بولے تو مرغا بنا کر سب سے موٹے لڑکے کو اس کی پیٹھ پر چڑھا دے۔ یہ عورت...... عورت...... عورت۔ منحوس، چڑیل، دیوی کتیا...... دل کی رانی...... ڈائن...... شکر ہے کہ چھٹی ہو گئی اور خواب ختم ہوا۔

آخر وہ شادی کیوں نہیں کر لیتا؟ مہا بیوقوف! ماں کہتی ہے۔

"کوئی اچھی لڑکی نہیں ملتی۔"

لڑکی اچھی بری؟ لڑکی لڑکی ہوتی ہے۔ نہ کہ اچھی بری اور اسے ساری لڑکیاں ایک ہی جیسی معلوم ہوتیں۔ جیسے پختہ اینٹیں...... سب کی سب چالاک، کاہل، مٹھو، اترانے والی۔ لڑکیاں نہیں ملتیں؟ اور یہ جو بھر بھر لاری اسکول کو جاتی ہیں۔ وہ کیا بکریاں ہیں؟ اسکول کی لاری میں فوراً ایک نئی جاذبیت پیدا ہو جاتی۔ چھٹی کلاس میں جب سے اسے مہترانی کی بہو کی کمر لچکتی نظر آئی تھی اس کے لئے لاری ایک اڑن کھٹولہ بن گئی تھی۔ جس پر پریاں لد لد کر شہر کے گناہ گاروں کا دل للچانے، گلی کوچوں میں مٹر گشت اڑاتی تھیں۔ اب بھی وہ جب لاری کا ہارن سنتا تو سوئے ہوئے دل کے سارے بھوت پریت جاگ اٹھتے۔ جلدی جلدی پیر مار کر لاری

کے پاس پہونچ کر اپنی بھوکی آنکھیں لڑکیوں کے جسموں پر چبھو دیتا...... مگر......

دور سے لاری میں لڑکیاں یہ لڑکیاں بھری ہوئی بالکل حوریں معلوم ہوتیں پر جب قریب آکر غور سے دیکھتا تو مرجھائے ہوئے کانٹے' کھڑے ہوئے چوکھونٹے' تکونے چہرے۔ رنگ برنگے چیتھڑوں میں الجھے ہوئے ایسے معلوم ہوتے جیسے خزاں آنے پر چند ڈھیٹ کیتھ کے پھل ڈالیوں پر لٹکے رہ جاتے ہیں۔ وہ آپس میں کج کج مرغیوں کی طرح کرتیں اور کوئی بھی تو ان میں سے اپنا حسین معصوم بھولا چہرہ مسکرا کر باہر نہ نکالتی۔ کسی کی بھی تو نرگس جیسی آنکھیں نہ ہوتیں۔چنبیلی کی کلیوں کی طرح نازک اور پتلی انگلیوں کے بجائے گھسے ہوئے چپٹے ناخون والی ٹھنگنی انگلیاں۔ سیٹی کے کانٹوں کی طرح جھولتی ہوئی لٹیں۔ میلی ناکیں اور الجھی ہوئی چٹیاں' اس کا رومان ٹوٹ کر چور چور ہو جاتا۔ وہ پکا ارادہ کرلیتا کہ اس غلیظ جنس سے اب وہ کوئی واسطہ نہیں رکھے گا بلکہ...... اس کے خیال تیرنے لگتے...... جب وہ نویں میں پڑھتا تھا تو آٹھویں میں کیسا نازک نازک سا ایک لڑکا پڑھنے آیا کرتا تھا...... مگر اس کے ساتھ اسے چند ناگوار واقعات یاد آگئے اور وہ بھڑک گیا۔

ٹن ٹن۔ کوئی کالج کی لڑکی سائیکل اڑاتی آرہی تھی۔ خواب پھر بدلے۔ کیا عجب سائیکلیں ٹکرائیں۔ جیسے ستارے ٹکراتے ہیں...... اور پھر طوفان...... گرج اور چمک...... بے ہوش حسینہ...... مگر...... وہ بریک...... لگا ہی نہیں۔ ایک ستارا کاوا دے کر نکل گیا...... ایک گرا دھم سے۔ گھٹنوں پر سے پیجامہ مسک گیا۔ گٹے چھل گئے۔ دوسرے ستارے کی ساری دور موٹر پر ہوا میں لہرائی اور گم۔

کاش اس کا بس چلتا! اس کا بس چلتا تو وہ بتاتا۔ منحوس لڑکی۔ بڑی علم حاصل کر رہی ہیں۔ کچھ نہیں' کچھ پڑھنے وڑھنے کی ضرورت نہیں...... جنگلی...... ان سے سادھو کی لڑکی ہی ہزار بلکہ کروڑ درجہ اچھی تھی...... دودھ تازہ' چمکتی ہوئی پیتل کی لٹیا میں باچھوں میں بہ رہا ہے۔ اس سے تو وہ سڑک کوٹنے والی ہی اچھی۔ گو اس کی کھال جھلس کر سائیکل کی گدی سے ملنے لگی ہے اور پنڈلیاں پھوڑوں سے لدی ہوئی ہیں۔ اور دو منٹ ساتھ بیٹھ جاؤ تو جوئیں بلبلانے لگیں۔ مگر ذرا آنکھ

جھپکاؤ مسکراہٹ کی بجلیاں تیار۔

وہ سائیکل والی لڑکی کے لئے نئے نئے کوسنے تراشتا ہوا چلتا۔ ٹانگ ٹوٹ جائے۔ چھوڑ کر چلا جائے کوئی اسے' کاش اس کے ناجائز بچہ ہو اور کالج سے نکالی جائے۔ وہ عورتوں کی طرح کوسنے لگتا۔ کالج میں پڑھنے والیوں کو یہی کوسنے دیتے ہیں۔

اور خواب اور خواب! کالے کالے بھوتوں کی طرح دانت نکال کر تھرکتے۔

حادثے' جنگل۔ سادھو اور اس کی لڑکی۔ ڈرائنگ روم' سڑک' لاری' شادی بیاہ سب گڈمڈ ہو کر ایک دوسرے سے الجھ جاتے اور سب کے سب سیاہ بادلوں کی طرح اس کی ہستی پر امنڈ کر گرجنے لگتے۔ اور پھر......

لوگ کہتے ہیں اسے "دماغی بخار" کی شکایت ہے...... میں سوچتی ہوں۔ شاید یہ بھی اس کا ایک خواب ہے۔

بیمار

اور پھر دندنا کر بخار چڑھتا اور ٹکٹکی بندھ جاتی۔ معلوم ہوتا ہڈیاں چٹ چٹا رہی ہیں اور کھال جھلنے لگتی۔ گلے میں رہٹ چلنے لگتا۔ چوں، چر...... شرڑ دکھڑ اور پھر کھانسی کے پھندے پڑنے لگتے۔

زبان تو جوتے کا تلا ہو گئی تھی۔ بکھٹی بکھٹی سڑاندی دوائیں کھا کے کھاتے اس میں جو گلٹیاں ہوتی ہیں وہ بھی مردہ ہو گئی تھیں۔ اسے یاد آتا تھا، جب کہ وہ چھوٹا سا تھا تو کونین کتنی کڑوی املیاں کتنی کھٹی اور شکر کی گولیاں کتنی میٹھی ہوتی تھیں۔ اس کی زبان کیسی جاندار اور حساس تھی! اور اب وہی زبان کس قدر ڈھیٹ ہو گئی تھی کہ کسی چیز کا اثر بھی نہ ہوتا تھا۔

بچے آنگن میں کلکاریاں مارتے اور ایسا معلوم ہوتا اس کے کلیجے پر گھن برس رہے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہوئے، دروازے دھڑا دھڑاتے ہوئے نکل جاتے اور اس کی زندہ لاش سر سے پیر تک لرز جاتی۔ پھر دوسری آوازیں، بھوپو والی لاریاں، کوکتی ہوئی موٹریں۔ کھڑکھڑاتے تانگے اور منمناتی ہوئی سائیکلیں، سب گویا اس کے سینے پر سے دندناتی گزرتیں۔

"رام رام ست ہے۔" اس کا کلیجہ مسل جاتا۔

"لینا دوڑنا...... چلیو!" وہ اپنا منہ معجونوں میں بسے ہوئے لحاف میں دبا لیتا گویا لوگ اسے ہی مارنے دوڑ رہے ہیں۔

اور کتے؟ کتے تو شیر تھے۔ ان کا بس نہ تھا جو اس کی گود میں لیٹ لیٹ کر بھونکتے اور بلیوں کو رات کے وقت کورٹ شپ کے لئے اسی کے کمرے میں آنا

فرض تھا۔ اس کی "شی شی" اور "ہش ہش" پر بلیاں مسکرا مسکرا کر اپنے عاشق بلوں کی طرف نیم باز آنکھوں سے دیکھتیں اور اٹھلاتی ہوئی "میاؤں" کر کے وہیں جا پڑتیں۔ دو ایک دفعہ ڈرنے کے بعد اب وہ بھاگنا بیوقوفی سمجھتی تھیں۔

اور پھر ہوا! خاک پڑی ہر دراز اور چھید سے چنگھاڑتی ہوئی سیدھی اسی کی طرف لپکتی اور اس کے جسم میں ٹھنڈک کے انجکشن دینا شروع کر دیتی۔ سر سر کرتی۔ دریا کی طرح اس کے کانوں میں گرتی اور گردن میں سے پھسلتی ہوئی ٹھیک سینے پر جم جاتی۔ گرمیوں میں یہی ہوا ریت کے گرم گرم ذرے لا کر اس کے جسم پر چنگاریوں یک طرح چپکاتی اور اسے بھٹی میں سونے کا مزہ آ جاتا۔ وائے موسم!

پر سب سے زیادہ دکھ دینے والی جو بات تھی وہ اس کا موٹا پڑوسی تھا۔ سرخ چقندر و بڑی گھندار مونچھوں والا۔ وہ آ کر دھپ سے بیٹھ جاتا...... اور موڑھا لبالب اس کے جسم سے بھر جاتا۔

"کیسے ہو؟" وہ بغیر بھولے ہوئے ہمیشہ ایک ہی لہجہ میں کہتا۔

اور پھر "بھابی ذرا پان تو دیجو ایک۔" وہ اس کی بیوی سے فرمائش کرتا۔ مرجھائی ہوئی آدھے درجن بچوں کی ماں کا لکیروں والا کتھئی رنگ کا چہرہ ذرا دیر کو مسکرا اٹھتا۔

"کبھی دہی بڑے کھلاؤ نا۔" "بھابی آج تو مٹر پلاؤ کھا کر ہی جاؤ گا۔" وہ دھنسی ہوئی تیمار داری کی عادی آنکھیں تھرکنے لگتیں۔ پپوٹے جھک جاتے اور پھر وہ اسے کچھ نہ کچھ چھینکے پر سے دینے یا کوئی اچار یا چٹنی چکھانے دوسرے برآمدے میں لے جاتی۔ وہاں سے اس کی چپڑ چپڑ کھانے اور بیوی کے کھلکھلانے کی آواز آنے لگتی۔

اس وقت فوراً اسے یا تو رفع حاجت کی اشد ضرورت لاحق ہو جاتی۔ یا پیا اٹھ کھڑی ہوتی یا اس کے کسی نہ کسی حصہ جسم کو دابنے یا مسلے جانے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

اس کے کئی بار پکارنے پر وہ جلی کٹی آتی۔ آنکھیں گھومی ہوئی اور چہرہ تنا

ہوا۔ گویا وہ قہقہے جو اسے دیوانہ کئے دے رہے تھے کچھ دیر پہلے ان ہونٹوں سے نہیں گزرے تھے۔ بلکہ کہیں کسی اور ہی دنیا سے آئے تھے اور وہ گھور گھور کر اس کے منہ کو تکتا گویا وہاں کوئی چیز چپکی ہی تو رہ گئی ہو گی۔

پانی پیتے اور ہاتھ پیر مسلواتے مسلواتے وہ تھک جاتا۔ مگر برآمدے میں بیٹھے بیٹھے جبڑے ویسے ہی چکی کی طرح چلا کرتے گویا انہوں نے اس کی ہستی ہی کو چبا ڈالنے کا ارادہ کر لیا ہو!

وہ بیمار تھا تو کیا' دل تو مردہ نہ ہوا تھا۔

پر اس میں بیوی کا کیا قصور تھا۔ وہ نوجوان تھی اور رگوں میں خون دوڑ رہا تھا' مگر وہ کبھی جھوٹ موٹ کو ہی اس سے کچھ کہتا تو وہ اینٹھ جاتی۔

"اے چلو مجھے یہ چونچلے نہیں پسند!" اور اس کا تنکے جیسا ہاتھ ہوا میں جھولتا رہ جاتا کبھی انہیں چونچلوں کے مارے اس کا میکے میں گھڑی بھر دل نہیں لگتا تھا۔ دن دن بھر وہ دونوں ہوتے تھے اور بند کمرہ۔ یہی ہاتھ کتنے شریر تھے اور اس پڑوسی نے تو اس کی بدھیا ہی بٹھا دی تھی۔ وہ خود نہ آتا تو قمیص میں بٹن ہی ٹانکنے کو بھیج دیتا۔ اور بیوی جان جان کر سینے میں اسے اپنے جسم پر ڈالتی۔ گو وہ چاہتی تو مزے سے الگ سے ہی سی سکتی تھی۔ وہ پڑوسی نہیں تو اس کا کرتا یا پاجامہ یا موزہ ہی اس کی چھاتی پر مونگ دلنے کو آن موجود ہوتا۔ اول تو تھا ہی کتنا خون جسم میں پر جو بچی کھچی دو چار بوندیں تھیں وہ پڑی سن سن کھولا کرتیں۔ اوہ! اس کا جی چاہتا تھا اپنی سوکھی سوکھی انگلیوں سے موٹے پڑوسی کے جسم پر سے گوشت کی تہیں کی تہیں اکھیڑ ڈالے اور اوپر سے نمک بھر کے مرچیں ملا کر اور اس وقت اس کی زبان کا مردہ پن جاتا رہتا۔

خاموش لیٹ کر وہ بیوی کو کسی کام میں مشغول دیکھتا! اس کے تخیل میں اسے صاف موٹے پڑوسی کی پرچھائیں نظر آتی۔ کاش وہ کسی ترکیب سے اس بدمعاش عورت کے خیالات کو قید کر سکتا! اس کا بس چلتا تو اسے سوچنے ہی نہ دیتا پر وہ تو گویا خاموش طعنے سے دیتی تھی۔

"لو پکڑ لو میرے خیالات کی دوڑ کو!" وہ چڑ جاتا، بدگمانیاں بڑھتیں، اسے اپنے سب بچے پڑوسی کی شکل کے معلوم ہونے لگتے۔ ویسی ہی ناچتی ہوئی آنکھیں، موٹے موٹے بدن، وہی گھومے ہوئے پاؤں اور سوجے ہوئے ٹخنے، بالکل پڑوسی جیسے، اور انہیں قریب بلا کر گھور گھور کر دیکھتا کبھی شک ٹلتا۔ کبھی اور جم جاتا اور وہ پاگل ہونے لگتا۔ اس کا دماغ قلابازیاں کھانے لگتا۔ یہاں تک کہ اسے بیوی کے پیٹ میں صاف صاف پڑوسی کی شکل کے بچے نظر آنے لگتے۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھتا اور اسے قریب بلا کر گھورتا۔ اوہ دھوبن بھی کتنی بے وقوف ہے آخر ساڑھیوں میں اتنا کلف دینے کی کیا ضرورت ہے؟ انسان کو دھچا ہی کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ انسان کتنا پھول جاتا ہے۔ خواہ مخواہ!

"دھوبن حرامزادی سے کہو اتنا کلف نہ دے۔" وہ جھلا جاتا۔

"کیوں؟ اب کلف اور ساڑھیوں میں بھی تمہارا دخل ہو گیا؟" وہ تنک کر جواب دیتی۔ ساڑھیوں میں تو اس کا دخل بے شک نہیں، پر آخر کیوں؟ اور بخار انگڑائیاں لیتا، اس کی سوکھی پنڈلیاں پھٹنے لگتیں اور پھیپھڑے زخمی کبوتروں کی طرح پھڑپھڑاتے کن پٹیاں پھدکنے لگتیں۔ اس کا جی چاہتا بیوی کی گردن پکڑ کر اتنی مروڑے کہ اس کا نرخرہ پھٹ جائے اور پھر اس کی ناک کاٹ ڈالے، ناک کاٹنا گو اب بالکل فیشن میں نہیں سمجھا جاتا۔ پر اسے تو ہر لمحہ تخیل کی دنیا میں بیوی کی ناک کاٹتے ہی گزرتا۔ وہ دیکھتا کہ اس نے ناٹ کاٹ ڈالی ہے اور چاقو کی نوک سے اس کے چہرے پر باریک باریک چارخانہ کاڑھ رہا ہے اور چونک کر بیوی کے چہرے کو دیکھتا۔ بیشک اس کے سارے منہ پر باریک باریک لکیریں نظر آتیں۔ لوگ کہتے تھے کہ پریشانی کی وجہ سے پڑ گئی ہیں، پر وہ خوب جانتا تھا اور دل ہی دل میں ہنستا تھا کہ یہ ہی تو لکیریں تھیں جو وہ چاقو سے اپنے تخیل کی دنیا میں کاڑھا کرتا تھا۔

رات کو بخار نئی قلابازی لگاتا۔ کوئی ٹکڑا جسم کا یخ ہو جاتا اور کوئی انگارہ کی طرح بھبکا کرتا۔ آنکھیں جلتیں تو ناک برف کی ڈلی ہو جاتی اور ہتھیلیاں سلگتیں تو پنجے گلنے لگتے۔ گلے میں جیسے کوئی دہی بلو رہا ہے گدی سن ہو جاتی۔ ڈاکٹر ٹٹول ٹٹول

کر اس کے جسم پر گوشت کی بوٹیوں میں سوئیاں لگاتا۔ کولھوں میں گٹھلیاں پھانسوں کی طرح چبھتیں۔

ذرا آنکھ لگی اور جیسے کسی نے ہزاروں روئی کے گٹھر کے گٹھر اس پر کھول کر بکھیر دیئے اور وہ سبکیاں لے کر اس میں ڈبکیاں لگاتا۔ ہاتھیوں کی وضع کے جانور اس کے سینے پر کودتے اور پنڈلیوں میں جیسے کوئی درے لگا رہا ہے۔ پلنگ کے نیچے سے سینکڑوں سوکھے بے گوشت ہاتھ اس کی طرف بڑھتے۔ اس کی کنپٹیوں پر مہین مہین غیر انسانی انگلیاں رینگتیں۔ خوابوں میں اس کے کل مردہ عزیز ہاتھ پھیلا پھیلا کر اسے بلاتے۔ بوڑھی دادی اپنا دگدگاتا ہوا سر ہلا کر اسے پھسلاتی۔ مگر وہ بڑی خوش اسلوبی سے ان لوگوں کو ٹال کر صاف لوٹ آتا۔ کہتے ہیں کہ خواب میں اگر کوئی مردہ عزیز بلائے اور اس کے ساتھ چلے جاؤ تو فوراً مر جاتے ہیں! وہ ان روحانی چالوں کو خوب جانتا تھا اور کوئی الو نہ تھا جو چرکہ میں آجاتا۔ آخر کیوں مرے وہ! وہ انتقاماً" جی رہا تھا۔ لوگوں کو آخر کیوں اس کی موت کی امیدیں لگی ہوئی تھیں؟ نہیں مرتا وہ! پھر کسی کو کیا؟

وہ لوگوں کے سامنے اور اکڑ کر لیٹتا۔ کوئی ذرا سی بھی بات ہوئی تو بہادر اور جھلے مزاج والے جوانوں کی طرح کڑک کر بولتا۔ لوگوں کی ہمدردی سے افسردہ چہروں کو دیکھ کر وہ سلگ اٹھتا۔ جی چاہتا کہ ان کی تھوتھنیوں کو کچل دے۔ جوں جوں وہ اپنے کو تندرست دکھاتا لوگ متفکر ہوتے جاتے۔

"سنبھالا لے رہا ہے!" وہ سر ہلا ہلا کر کہتے۔

لوگ اسے نہ جانے کیا سمجھتے تھے۔ کبھی وہ دن تھے جب کنبے رشتہ کی ساری کنواریاں اس سے بچائی جاتی تھیں۔ جیسے وہ انہیں کھا ہی تو جاتا۔ اور وہ لڑکیاں بھی تو اسے دیکھتے ہی تلملا اٹھتیں ان کے چہرے تمتما اٹھتے اور جو کام کرتی ہوتیں وہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ پڑتا۔ بھاگتیں تو فور گر پڑتیں منہ ڈھانکنا چاہتیں تو دوپٹہ ہی اتر جاتا اور وہ بے بس اس کے رحم و کرم پر رہ جاتیں اور وہ تھا بھی بڑا بے رحم دل!

اتنی ڈھیر کی لڑکیاں اس سے شرماتی تھیں کہ وہ کچھ فیصلہ بھی تو نہ کر سکتا

تھا۔ کبھی منجھو پر وہ مرجاتا' کبھی بانی اس کے دل کا ٹکڑا بن جاتی اور کبھی ان سب کو مع اس پر ہوس دنیا کے وہ چھوڑ کر مٹی کا پجاری بن جاتا اور پھر کبھی ایک دم سے گر بڑا کر وہ سب پر ایک دم ہی ٹوٹ پڑتا!

پر اب تو عرصہ سے اس نے شرمانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ مہترانی کی جوان بہو' آنکھوں میں آنکھیں ڈال ڈال کر ایسے باتیں کر لیتی جیسے وہ کوئی بلی یا چوہا ہے اور منجھولی جن سے قریب قریب آدھی منگنی ہو گئی تھی اور شادی سے پہلے اس کے آنے کی خبر سن کر ان پر ہسٹریا کا دورہ پڑ جاتا تھا۔ مزے سے بیٹھی اپنے بچے کو اس کے سامنے ہی دودھ پلایا کرتی۔ اور جانی اپنی پوشیدہ بیماریوں کا ذکر اس کے ڈاکٹر سے اسی کے سامنے کھلے بندوں کرتی۔ لوگ اسے خطرے کی حدوں سے باہر کر چکے تھے۔ اس کی زندگی کے بہترین زمانہ کو ناعاقبت اندیشی کا زمانہ کہہ کر معاف کر چکے تھے۔ ایک دفعہ اس نے چاہا کہ ان لوگوں کے ذرا ہوش ٹھکانے کر دے اور وہ نوجوان ماما کو دیکھ کر کچھ بڑبڑایا' پھر وہ کانپنے لگی۔

"اے ہے بھیا کا بخار بہت ہی چڑھ رہا ہے۔" وہ اٹھلائی ہوئی چل دی۔ سب اسے بھیا کہنے لگے تھے۔ جب سے وہ بیمار پڑا تھا لوگ بن بن کر اسے جلاتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کا بوڑھا چچا تک اسے "بھیا" کہہ کر چمکارتا تھا۔ بڈھا اینٹھتا تھا۔ سمجھتا کہ وہ اس کے اتنا بھی نہیں جینے کا اور بہت جلد دوسری دنیا کو کوچ کر جائے گا! ہونہہ! لوگ آس لگائے مر جائیں گے۔ مگر دھند میں نہیں مرے گا وہ جئے گا! جئے گا! خواہ کتنے ہی لرزے چڑھیں۔ جھیپھڑے دکھیں پڑوسی آئیں اور بیوی مسکرا مسکرا کر ان کے سڑاندے موزے سیئے۔ پر وہ جئے گا۔ خواہ اس کے سب بچے پڑوسی کے ہم شکل ہو جائیں سب پڑوسی سے ملنے لگیں' اس کے بھائی ماں باپ بہن سب پڑوسی کی طرح آنکھیں مٹکائیں اور پاؤں گھمائیں نخنے سجالیں پر وہ جئے گا۔ انتقاماً" جئے گا! یہ تو ہونے سے رہا کہ وہ لوگوں کو اطمینان کو مر جائے۔

وہ دیکھتے ہی انسان کو بھانپ جاتا۔ وہ اپنی عیادت کرنے والوں کے چہروں کو غور سے دیکھتا اگر ان پر افسردگی چھائی ہوتی تو وہ بگڑ جاتا۔ یہ سب مفسدوں کے

چہرے ہوتے ہیں اور وہ انہیں جلے کٹے جواب دیتا- جو لوگ مریض کا دل خوش کرنے کو ذرا مسکرا کر آتے انہیں وہ مکار سمجھتا- وہ الو سمجھتے تھے کیا؟ وہ گھر سے ہی اسے "بس اب اچھے ہو جاؤ گے" "اللہ نے چاہا تو جلد شفا ہو گی-" جیسے سنانے آتے تھے اور ایسے لوگوں کے نازک معاملات پر گفت و شنید شروع کر دیتا- ان کے چہروں سے مسکراہٹ اڑ جاتی اور وہ بدحواس ہو جاتے اور جو اگر کسی کے چہرے سے کچھ بھی نہ ظاہر ہوتا تو وہ اسے پکا الو سمجھ لیتا- وہ اسے عجیب و غریب طریقوں سے نقصان اٹھانے ذلیل ہونے لٹھ بازی کرنے اور مقدمہ چلانے کے فوائد سمجھایا کرتا- یہاں تک کہ عیادت کو آنے والے کے چہرے پر وحشت اور جنون کے تسلی بخش آثار نظر آنے لگتے- تب وہ اطمینان سے ہنستا اور آؤ گے؟ خواہ مخواہ وہ دل ہی دل میں اس سے پوچھتا-

جتنے ڈاکٹر آتے بدمزہ سے بدمزہ دوا تجویز کرتے' اس کے سینے پر مالش کرنے یا انجکشن لگانے کے بہانے اس کی بیوی کی فضول مدد کے خواستگار ہوتے- وہ بے بات بھی اس کی انگلیاں ٹٹولنے کے بہانے اور خون کی کمی وغیرہ کے بہانے اسے مرغن کھانے اور لذیذ دوائیں کھانے کو بتا جاتے- کوئی ہی ایسا ڈاکٹر ہو گا جس نے فوراً ہی بیوی کے لئے نسخہ پر نسخہ نہ لکھ دیا ہو! وہ انہیں موٹی موٹی گالیاں دیتا اور کل بیوی کے نسخے پھاڑ ڈالتا' اس کا بس نہیں تھا کہ مٹھی بھر اپنے جراثیم پچھاڑ کر پلا دیتا-

کبھی وہ بھی زمانہ تھا کہ یہی بیوی اس کے جنم مرن کی ساتھی بنی تھی اور سنگ میں جان دینے کے وعدے کر چکی تھی پر اب جراثیم کے ڈر سے فینائل سے ہاتھ دھوتی اور سوڈے سے غرارے کرتی تھی- کتنی گہری خلیج دونوں میں حائل ہو گئی تھی-

اور پھر بخار چڑھتا' پھیپھڑے پھولتے' گلے میں گاڑی سی چلتی ہڈیاں چٹختیں اور وہ جسمانی اور روحانی دکھوں میں ڈوب جاتا-

کیوں رے کتے
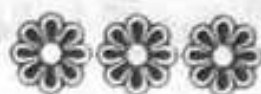
"اے لو سوا سات سیر کے...... چھوٹے سیر سے۔" رشید کی ماں نے اپنا سوکھا ہوا ہاتھ رضائی سے نکال کر پھر واپس رکھ لیا۔ گویا اس مہنگی موئی دنیا سے دستبردار ہو گئیں۔

اور گھی وہی گھاسلیٹ کا بہن، لالہ جی تو منہ پر نہیں دھرتے، میں تو دودھ منگا کر گھر میں بلو لیتی ہوں۔ اور چھاچھ بھی کام آ ہی جاتی ہے" سیٹھانی نے کنجوسی سے متاثر ہو کر کہا۔

"ترکیب تو اچھی ہے۔ رشید بھی گھی دیکھ کر منہ بناتا ہے، کہتا ہے روکھی کھا لوں گا پر گھاسلیٹ تو نہیں چلتا۔ بہت کرتی ہوں بہن میری بلونا اب کون کرے، ہاں مکھن منگا لیتی ہوں۔"

"مکھن میں کیا میل نہیں ہوتا؟ اے لو مکھن میں تو بڑے مزے سے تیل ملاوے ہیں۔ دودھ میں ہی ملا دیتے ہیں اور پتہ بھی نہیں چلتا تم...... تم یہ کرو...... "اور وہ نہ جانے کیا کیا ترکیبیں بتانے لگتیں۔

برجو کا دم گھٹنے لگا۔ اسی کو پرنام کر کے وہ کونے میں بیٹھی اپنی ساری کے پلو سے کھیل رہی تھی اور اس آٹے دال کے بھاؤ سے تو اس کا دل اور بھی گھبرا رہا تھا۔ وہ کیوں آئی آخر۔

"مرچیں تو مہینے کے مہینے پسوا لیتی ہوں" بچپن کی بچھڑی دو سہیلیاں پھر وہی

غیر دلچسپ باتیں کرنے لگیں۔ اگر شاما یا اختری ہوتی تو برجو کبھی بھی ان سے اس قسم کی خشک گفتگو نہ کر سکتی، اور پھر جو ذرا کپڑوں کے متعلق گفتگو چھیڑ دی تو برجو نے بھی دلچسپی کا اظہار کرنے کی ہمت کی۔ مگر اس کا دل ٹوٹ گیا۔ جب دریوں، جھاڑنوں اور نواڑوں وغیرہ کا ذکر ہونے لگا۔ نیلی جارجٹ کی کنی دار ساڑھی اور ٹمیو کے آڑے جمپر کی کسی نے بات بھی نہ پوچھی۔ وہ پھر اپنے ناخن سے ساڑھی کا پلو کھرچنے لگی۔ مگر جب سینکوں اور صراحیوں کا ذکر آیا تو اس کے گلے میں جیسے پھندا پڑنے لگا اور وہ بولا کر کھڑی ہو گئی کسی نے بھی اس کا نوٹس نہ لیا۔ چونکہ دونوں سہیلیاں بڑی سے بڑی مٹکی حیرت انگیز سستی قیمت پر خریدنے کا فخریہ قصہ سنانے پر تیار تھیں، دونوں کے میکوں میں مفت سے بھی سستی صراحیاں ملتی تھیں اور اتفاق سے دونوں کی سسرالوں میں ٹھگ بدیا کھلے بندوں ہوتی تھی۔ پلنگ کی ادوانوں اور بان کے چھینکوں کا ذکر ادھ سنا ہی چھوڑ کر وہ برآمدے میں آ گئی۔ باہر پڑوسن کے دو بچے کھڈیوں پر بیٹھے کسی نہایت ہی دلچسپ مسئلہ پر لڑ رہے تھے۔ دور ایک گائے کھڑی کوڑا کھا رہی تھی۔ برجو الجھ کر برآمدے میں رکھے گملوں کو دیکھنے لگی۔ دو ایک خوش رنگ پھول توڑ کر اس نے اپنی لمبی چوٹی کے بالائی سرے میں اڑس لئے اور نیچے کیاریوں میں سے دھنیے کی ننھی ننھی پتیاں توڑ کر سونگھنے لگی۔ بڑے گھڑاپے میں آ کر اس نے منڈیر پر اگی ہوئی بیکار گھاس کو نوچ کر الگ کر دیا اور چنبیلی کی مڑی ہوئی ڈالیوں کو سیدھا کرنے لگی۔

"برجو...... او برجو۔" ایک کرخت آواز اسے سنائی دی، اور وہ چونک پڑی۔

"ارے سنا نہیں۔ برجو و و و۔" آواز اور بھی بھاری اور کرخت ہو گئی۔ وہ دوڑ کر جلدی سے برآمدے میں آ گئی۔

برجو۔ برجو...... برجو...... کوئی مکروہ آواز پکارے گئی۔ اس کا دل چاہا جلدی سے ماں کے پاس بھاگ جائے۔ جہاں بس آٹے دال کا بھاؤ سنتی رہے، مگر آواز اور بھی دھمکی آمیز اور ساتھ ساتھ امدادِ طلب نظر آئی۔ کیا وہ ڈرپوک تھی جو کچھ ڈر جاتی۔ نہ جانے کون جنگلی اسے کیوں پکار رہا تھا۔ آواز پھر آئی اور کوٹھے پر سے آتی

"تم نکل جاؤ میرے کمرے سے----- ابھی-----" وہ پیچھے کھسک کر اٹھنے لگی۔

"ابھی----- ؟ اس نے حیرت سے کہا۔ "اس حالت میں----- توبہ کرو وہ مجھے-----"

"ہاں اس حالت میں-----" برجو اسے دبتا دیکھ کر بہادر بنی۔

"خوب!" اس مصیبت میں بھی اسے خوش مذاقی سوجھ رہی تھی، اور جو وہ مجھے کتے کی موت مار دیں تو پھر----- آپ----- آپ کا کیا جائے گا۔"

"میں----- میں" وہ شاید کسی کو پکارنے کی دھمکی دینے والی تھی۔

"اگر آپ چلائیں گی تو مجھے مجبوراً" آپ کے نازک گلے کو اپنے کریہہ ہاتھوں سے گھوٹنا پڑے گا۔ میں کہتا ہوں آپ ڈرتی کیوں ہیں۔ میں کوئی ہوا تو نہیں ہوں جو آپ کو کھا جاؤں گا چپکی پڑی رہیے۔"

"آپ کو اس طرح میرے کمرے میں آنے کا کیا کوئی-----؟"

"بالکل نہیں----- قطعی نہیں----- مگر سنیئے تو----- میرے پیچھے چاوڑی سے ڈیڑھ سو کے قریب لفنگے لگے ہوئے ہیں----- نہ جانے کیسے کیسے گھنٹہ بھر سے بھاگم بھاگ یہاں تک آیا ہوں، اور مجبوراً" مجھے آپ کے دولت خانہ میں بغیر اجازت کے گھسنا پڑا----- یقین مانیئے مجھے رات کے بارہ بجے آپ جیسی حسین چھوکریوں کے کمرے میں گھسنے کی قطعی عادت نہیں----- ہاں----- اور میں ذرا دیکھو تو آپ----- کہاں ہے آپ کا----- وہ آپ کی بجلی----- ذرا جلائیے تو-----"

"بالکل نہیں۔ آپ نکل جائیے یہاں سے ورنہ-----" برجو نے ذرا تن کر کہا۔

"ورنہ----- ورنہ کیا؟" آنے والے نے بجلی کے بٹن کو تلاش کرنا شروع کیا۔

"ورنہ یہ کہ میں ابھی-----"

معلوم ہوئی۔

نہ جانے کیوں وہ سیڑھیوں پر چڑھنے لگی...... یقیناً وہاں کوئی اسے پکار رہا تھا۔ اماں تو نہ تھی..... اتنی موٹی اور بھدی آواز! اور بابو جی کا تو گمان بھی...... خیر وہ چڑھتی چلی گئی۔

"معلوم ہوتا ہے آج اس کی شامت آئی ہے۔ ارے برجو!" کسی نے اسے پکارا۔ اور وہ ڈر کر روندتی ہوئی دروازے تک آ ہی گئی......!

سامنے میز کے پاس' ایک کرسی پر ایک چوڑی سی برہنہ پیٹھ ایک قلم سے کھجتی ہوئی نظر آئی۔

"کہاں مرگیا تھا کمینے۔" پیٹھ کا مالک بغیر مڑنے کی تکلیف اٹھائے ڈانٹ کر مخاطب ہوا۔

"خدا کی قسم' ذرا یہ صفحہ ختم کر لوں تو...... ہاں یہ تو بتا گیا کہاں تھا؟...... کیوں رے کتے؟" قلم ویسے ہی ایک لمبے صفحے پر چلتا رہا اور سر جھکا رہا۔ برجو کو ہنسی آئی اور تھوڑی دیر کو غصہ بھی۔ یہ کون گستاخ تھا جو اس بیہودگی سے اس سے خطاب کرنے کی جرات کر رہا تھا۔ اس کے بابو جی بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے اسے ہمیشہ "برجو بیٹے" ہی کہتے تھے...... مگر یہ......

"اب کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے کتے۔" چوڑی پیٹھ والے نے "تے" پر زور دے کر کہا۔

"جا گلاس میں پانی لا۔"

"برجو کا جی چاہا زور سے کھانسے' اور غرور سے تن کر اسے بتائے کہ تم خود کتے! مگر......"

"اب جاتا ہے کہ میں اٹھوں...... بغیر دیکھے اٹھنے کی دھمکی دیتے ہوئے کہا گیا۔

برجو لوٹ آئی...... اسے غصہ آ رہا تھا...... یقیناً پاگل تھا کوئی...... پر ماسی کے گھر میں پاگل اور انہیں یہ پتہ بھی نہیں۔ اس نے سوچا جا کر حالات سے ماسی کو

مطلع کرے۔ لعد پھر کلیجے پر پتھر رکھ کر آٹے دال کی قیمت پر بحث کر ہی ڈالے۔ مگر اس نے سیڑھیوں پر سنا "جو تو نے دیر کی تو سر توڑ دوں گا جوتوں کے مارے۔ سنا' ٹھنڈا پانی لائیو۔"

اس کی جوتی لاتی تھی پانی بدتمیز کے لئے...... مگر نیچے جا کر اس نے صراحی سے پانی انڈیلا اور نہ جانے کیوں وہ دل میں ایک دلچسپ مہم کا خیال لے کر مسکراتی ہوئی چلی۔

اس نے سیڑھیوں پر سے سنا "تو ہم کچل ڈالیں گے...... جب انتہا ہو جاتی......جب...... ہوں...... ٹھیک۔ ہاں ظلم کی انتہا ہو جاتی ہے تو مظلوم ظالم کا گلا چبا ڈالتا ہے......"

برجو کو ایک پھریری سی آئی۔ اور اس کا دل چاہا وہ فوراً لوٹ جائے۔ گلا چبا ڈالتا ہے۔ ارے!"

"برجو......" ایک لمبی پکار پر اس نے جلدی جلدی چڑھنا شروع کیا۔

"کیوں؟ کیا کنواں کھود رہا تھا......؟" قلم تیزی سے کچھ لکھ رہا تھا...... برجو چپ کھڑی رہی۔

"جس کام کو بھیجو مر کے رہ جاتا ہے...... تو نے تو بس تھکا دیا اور وہ خط ڈال آیا تھا...... ارے خیر...... میں پورا کر دوں گا اور بس تو نے دیر کی تو پھاڑ دوں گا سر تیرا......"

برجو کا عجیب حال تھا' وہ چاہتی تھی کہ ایک دم بھاگ جائے' یہ معاملہ کیا ہے؟

"اب کیا سر پر رکھے گا میرے...... رکھ دے نا یہ گلاس۔" ہاتھ نے قلم سے میز کا کونا کھٹکھٹا کر کہا۔

برجو نے گلاس رکھ دیا اور لوٹنے لگی۔ مگر پھر رکی! کیونکہ......

"ٹھہر...... یہ چلا کہاں...... پھر وہی گلی ڈنڈا...... ایک ملک ایک قوم......ہاں ابکے جو میں نے تمہیں کلوا کے ساتھ کھیلتے دیکھا تو بس...... یہی ایک

علاج ہے...... مگر......"

برجو کا شبہ یقین کی حد تک پہنچ گیا- کوئی پولٹیکل پاگل ہے! دو لفظ پڑھتا ہے تو دو لفظ خود بخود بڑبڑانے لگتا ہے- اگر بگلی رمو ہوتی تو برجو اس کے گڑچنے مانگ کر چھیڑتی رحمٰن خاں ہوتے تو ان سے مرغی کے انڈوں اور پتلی دال کا ذکر کر کے تنگ کرتی- وہ کوئی پاگل سے ڈرتی تھی...... مگر یہ عجیب و غریب پاگل- اس کا جی چاہا کہ ایک دم بھاگ کھڑی ہو مگر جیسے کسی نے اس کے پیر پکڑ لئے-

"ہاں ذرا ٹھہر- میں پیکٹ بنا لوں...... گوند...... گوند کہاں گیا کتے! اوہ......"

گوند میز پر ہی مل گیا- پھر سیٹی بجنے لگی اور گھٹنے ہلنے لگے- ناخونوں سے میز پر طبلہ بجا...... "سانوریا من بھایا......" بے سرے سروں میں گایا گیا- برجو حیرت سے کھڑی سنتی رہی اب اسے ذرا ڈر لگا- اس نے چاہا چپکے سے کھسک جائے- مگر......

"اور ہاں یہ تو میری کیاریوں میں کیا کر رہا تھا؟" برجو نے کیاریوں پر کوئی دست درازی تو کی نہیں- مگر پھر بھی وہ چونک پڑی' اور اسے یقین ہو گیا کہ وہ دیکھ لی گئی ہے-

"میں نے تجھے کتنی دفعہ منع کیا کہ تو میری کیاریوں سے دھنیا مت توڑا کر- مگر جب دیکھو چٹنیاں پیس پیس کر بھکس رہا ہے- اب کے میں نے تجھے کیاریوں کے پاس بھی گزرتے دیکھا تو......"

قلم پھر تیزی سے چلا "یہ ختم کر لوں تو دوں...... جب تک تر مرغا بن...... سمجھا"

برجو کو مرغا بننا نہ آتا تھا- وہ بالکل نہ سمجھ سکی-

اس کو حیرت تھی کہ یہ کیسا پاگل ہے جو بولتا بھی جاتا ہے' لکھتا بھی جاتا ہے' اور سیٹی بھی وقتاً" فوقتاً" بجا دیتا ہے' وہ بھاگ کیوں نہ کھڑی ہوئی- اسے ڈر تھا کہ کہیں لپک کر دبوچ نہ لے اور پھر...... چبا ڈالتا ہے...... کچل ڈالیں گے...... کتنا عجیب پاگل! وہ چپکے چپکے کھسکی! مگر پھر رکی! ظالم پھر گرجا-

"اور یہ میرے سفید پھول کس نے توڑے تھے...... بول اکبے جو تو نے پھول چھوا تو بس یاد ہی کرے گا۔ آخر تو میری کیاریوں سے بھڑتا ہی کیوں ہے؟؟" اور پھر سیٹی بجنے لگی۔

برجو کا مارے غصے کے منہ لال ہو گیا۔ وہ سدا سے ماسی کے یہاں آتی تھی، جتنے پھول جی میں آتا تھا توڑتی تھی، اور جو گملا پسند آتا لے جاتی۔ اور یہ آخر کون کمینہ تھا جو اسے منع کرنے کی ہمت کر رہا تھا۔ اسے شاید پتہ نہیں تھا کہ وہ کون ہے...... لالہ کھیم چند کی اکلوتی بیٹی...... اور...... برج رانی۔ جسے کبھی کسی نے ترچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔

"کہتا ہوں لان پر مت لوٹا کر......"

برجو نے صرف بیکار گھاس نوچی تھی!

لفافہ تیار ہو گیا، اور پیٹھ مڑی۔ برجو ذرا اور کھسکی۔ وہ پچھتانے لگی۔ آخر دال آٹے کے بھاؤ میں ایسا کیا عیب تھا جو وہ اس کا ذکر بھی نہ سن سکی اور اس مصیبت میں پھنسنے کو آ گئی۔

"ایک بات! تو نے میرے موزے دھو دیئے۔" لفافہ پر پتہ لکھا گیا۔ برجو اور موزے دھوئے!

"بولتا کیوں نہیں------ کیوں رے کتے!"

اور چوڑی پیٹھ دیوار کی طرف چلی گئی------ اور------ گھنے بالوں والا سر گھوما۔

"ارے------ آپ------ آ------ آ------ میں۔" لفافہ جان کر گرایا گیا اور پھر اٹھا لیا گیا۔

دروازہ کھلا اور بوکھلائی ہوئی شکل کا ایک لمبا میلا سا چھوکرا تھیلی میں کچھ لئے ذرا ہانپتا ہوا آیا۔ برجو نے اطمینان کی ایک لمبی سانس لی اور دو انچ لمبی کھنچ گئی۔

"اوہ------" برجو کچھ کھسیائی اور بہت کچھ سٹپٹائی لوٹ پڑی، سیڑھیوں پر سے نیچے اترتے وقت وہ پھر چونکی۔

"کیوں بے برجو اب لوٹا ہے جب کا گیا؟----- چل اب سیدھی طرح----- بن مرغا----- گھنٹہ بھر-----" تڑ سے تھپڑ کا پٹاخا سنائی دیا----- "کیوں رے کتے۔"

برجو ماسی کے قریب بیٹھ کر پھر ساری کے پلوؤں سے کھیلنے لگی۔

"اور بہن میں نے جو اچار ڈالا تھا سو بھی ساری پھپھوندی لگ گئی۔" برجو کی ماں بے تکان کہہ رہی تھی۔

بن بلایا مہمان

کہتے ہیں اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ، ہم ہندوستانی ایسے جنگجو واقع ہوئے ہیں کہ بس بات بے بات جو تم پیزار۔ مسجد کے سامنے کافروں نے ڈھول پیٹے۔ مسلمانوں نے ڈھول پیٹنے والوں کو پیٹ ڈالا۔ مندر کے آگے تعزیئے نکلے اور لٹھ چلا۔ دراصل ہم لوگ حساس بہت واقع ہوئے ہیں-----"

پیپل کا ایک شریر گدا عین سڑک پر جھک آیا اور جب قدر آور تعزیوں نے ادھر سے چہل قدمی کی کوشش کی تو جھکنے کی ضرورت پڑی۔ تعزیئے اور جھکیں! اور گدا وہ بھی پیپل کا! توبہ کیجئے اسی طرح ڈٹا رہا۔ نتیجہ؟ سینکڑوں گھر لٹ گئے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے گھر پھونک دیئے۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کو کاٹ کے رکھ دیا۔ یہ تو لمبی داستان ہے۔ مگر ہم میں سے کون ایسا ہے جس کے لئے یہ نئی بات ہے۔ ہمارے پردادا کے وقت سے لے کر اب تک تعزیوں اور پیپل کے گدوں کا خاندانی بیر چلا آتا ہے۔ اور خدا نہ کرے جو ہم اپنی قومی خوبیوں کو خیرباد کہیں اور جب مسلمانوں نے گدا کاٹا تو اندازہ لگا لیجئے کیا ہوا۔

اور جب ہندو مسلمان لڑ رہے ہوں تو برجو ماسی کو دیکھنے کیسے جائے۔ گلی میں جب "لیجیو پلیو" کا غل مچتا تو برجو کمینہ مسلمٹوں کو ان کے مظالم سے باز رکھنے کے لئے تلسی کے پیڑ کے آگے دونوں وقت ہاتھ جوڑ کر ماتھا ٹیکتی----- مگر اس دن کمبختوں نے تلسی کے گملے کو بھی تو ہاتھا پائی اور دھکا پیل میں کچل کر رکھ دیا تھا،

نہ جانے کہاں سے غول بیابانی بڑے پھاٹک کو پھاند کر آن پہونچا تھا۔

رات کو وہ اپنے کمرے میں آنے سے پہلے ماں سے لپٹ لپٹ کر اطمینان کر لیتی کہ گھر میں پرندہ پر بھی نہیں مار سکتا۔ اور اس کے کمرے کے پاس ہی گورکھوں کو تعینات کر دیا گیا ہے۔ پر کوئی رات کے گیارہ بجے جبکہ خواب میں پھٹے کپڑوں والے زخمیوں کو گلیوں میں گرتا پڑتا دیکھ رہی تھی۔ ایک دم اس کی آنکھ غیر معمولی کھٹکے سے کھل گئی اور ایک بھیانک سایہ دھندلکے میں کھڑکی میں سے داخل ہوتے دیکھ کر اس کی گھگی بندھ گئی۔ اس سے قبل کہ اس کے چلانے کی طاقت عود کر آئے وہ بھیانک سایہ اس کے اوپر جھک کر عجب طرح غرایا کہ وہ سہم گئی۔

"خبردار جو------" برجو بستر میں دبک گئی۔ نیچے بے طرح غل مچ رہا تھا۔ شاید کوئی شکار گلی والوں کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کے کمرہ میں پناہ لینے آیا تھا------ لیکن------ اگر وہ اسے قتل کرنے آیا تھا تو؟ وہ پھر چیخنے لگی۔ سائے نے فوراً اپنے کھردرے سخت ہاتھوں سے اس کا منہ بھینچ دیا۔

"تم چیخو گی تو------ میں تمہارا گلا دبا ڈالوں گا------ سمجھیں------ وہ مجھے مارنے آرہے ہیں------ مار ڈالیں گے------ کمینے۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا اور گرفت ڈھیلی کر دی۔

برجو بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔

"تم بڑی ڈرپوک ہو۔" مخاطب کے لہجہ میں ہنسی کا شائبہ تھا۔

"تم------ ہو کون؟"

"میں کوئی بھی ہوں------ وہ لوگ مجھے مارنے آرہے ہیں------ خدا کی پناہ------ شاید انہوں نے مجھے آتے دیکھ لیا۔" اس نے ذرا اٹھتے ہوئے کہا۔ گلی میں غل سنائی دے رہا تھا۔

اندھیرے میں اسے بولنے والے کا نقشہ تو نظر نہ آیا------ مگر "خدا کی پناہ!" اسے وہ پہچان گئی کہ کوئی مسلمان ہے------ بعض وقت خدا کا نام لینا بھی آفت میں پھنسا دیتا ہے۔

"کسی کو بلا لیں گی! یہی نا!"

"ہاں!"

"پھر؟"

"پھر------ پھر------ تم------"

"کتے کی طرح آپ کے کمرے میں ذبح کر دیا جاؤں گا۔"

میز پر رکھے ہوئے لیمپ کو روشن کرنے پر برجو کی حیرت کی انتہا نہ رہی "کیوں بے کتے؟" اس کی دماغ میں گونجنے لگا۔ ماسی کے گھر والا دیوانہ انسان' خون اور کیچڑ میں لتھڑا چیتھڑوں میں ملبوس' ہاتھ میں ایک حقیر سی چھڑی لئے' لیمپ کی روشنی سے گھبرائی ہوئی آنکھیں جھپکا رہا تھا۔ رشید اس کی ماسی کا بیٹا۔ وہ کچھ متحیر اور کچھ خوفزدہ اپنے کو ساری میں لپیٹتی ہوئی پلنگ کے دوسری طرف کھڑی ہو گئی۔

"کیا آپ پسند کریں گی کہ آپ اس وقت باہر گلی میں چلی جائیں۔" اس نے شاید برجو کو نہ پہچانتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ میرے کمرے میں رہیں------"

"اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنی بوٹیاں نچوانے باہر چلا جاؤں۔"

"آپ بڑے بزدل ہیں؟"

"ہیں ہیں؟ مگر ذرا سوچئے تو------ میں نے------ میں کس طرح اتنے درندوں سے لڑ سکتا ہوں۔"

"میں کیا جانوں۔"

"لیجئے وہ------ شاید وہ پھر آ گئے۔" شکار نے احاطہ میں غل سن کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اور دروازہ بند کر دیا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" برجو نے گھبرا کر کہا۔

"شاید دروازہ بند کر رہا ہوں" اس کے لہجہ میں ایک تلخ تبسم جھلک رہا تھا۔

"اور پھر------"

"میں------ آپ کو ابھی ان کے حوالے کر دوں گی" برجو نے جھلا کر کہا

اور دروازے کی طرف بڑھی۔

"کیا آپ نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے مر جانا چاہیئے۔" بن بلائے مہمان نے ذرا طنز سے کہا۔

"یہ میں نہیں جانتی۔" برجو نے ذرا تکلف* سے جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے------ میں یہیں مروں گا!" اور وہ کرسی پر ڈٹ کر بیٹھ گیا۔

برجو ٹھٹکی "تمہیں باہر جانا پڑے گا" اس نے رعب سے کہا۔

"مرنے کے لئے نا؟ خوب------ جی نہیں میں یہیں اسی جگہ مروں گا------ تاکہ آپ دیکھیں کس طرح میری گردن میں سے خون کے شراٹے نکلتے ہیں۔ بھئی جہاں میرا دل چاہے گا وہیں مروں گا' نہ کہ آپ کے حکم کے مطابق!"

برجو نے پھریری لی۔

"اور تازہ تازہ خون! لال لال! یہاں بہے گا" اس نے اپنے چاروں طرف اشارہ کیا۔

"مگر------" برجو لوٹ پڑی۔

"اگر نا مگر------ اور پھر' میں بھوت بن کر آپ کو------ آپ کو------ بس خوب سمجھ لیجئے خوب!"

"آپ کمرے سے چلے جایئے۔" برجو کچھ لاچار سی ہو گئی۔

"جی نہیں------ اب تو آپ دیکھیں ------ آپ نے کبھی بکرے کٹتے دیکھے ہیں۔ کھچا کھچ گوشت کا قیمہ بنتے' ہڈیوں کا چورا ہوتے دیکھا ہے۔" کمزوری سے فائدہ اٹھایا گیا۔

برجو نے دو دفعہ قصائی کی دکان دیکھی تھی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"اور میرا سر وہ اینٹوں سے پھوڑیں گے------ میرا بھیجا یہاں------ اور کیا عجب یہ سب آپ کی خوبصورت چیزیں میرے خون سے لتھڑ جائیں۔ بہتر ہو کہ آپ ذرا اپنا سامان وغیرہ کھسکا لیں۔ کیونکہ وہ لوگ مجھے آسانی سے ذبح نہ کر

سکیں گے- وہ گھمسان کی لڑائی ہو گی----- یاد رکھیے----- آپ مجھے بزدل کہتی ہیں، چار کو مار کر مروں گا-"

"آپ بڑے----- بڑے عجیب آدمی ہیں-" برجو مجبور ہو کر مڑی-

"کیا سمجھتی ہیں آپ؟----- سمجھا کیا تھا آپ نے مجھے-----" اکڑ کر سینہ تانتے ہوئے کہا گیا- "دیکھئے گا آپ خون کا دریا بہہ جائے گا- بس خون ہی خون- چھ سات لاشیں گریں گی-" احاطے میں غل بڑھتے دیکھ کر عجیب و غریب پاگل بولا-

برجو دروازے کے قریب گئی تو اسے زور زور سے بولنے کی آوازیں سنائی دیں- بلوائی شاید شکار کو نوکروں کے حصے میں ڈھونڈنے کے بعد خاص مکان کی طرف بڑھ رہے تھے- گورکھے اتنے بڑے انبوہ کو سنبھالنے میں ذرا مشکلات محسوس کر رہے تھے-

"وہ مکان میں تلاشی لینے آ رہے ہیں" برجو نے گھبرا کر کہا- تھوڑی دیر کے لئے اس بے فکر انسان کا چہرہ متغیر ہو گیا-

"آپ کو مجھے چھپانا ہو گا" اس نے برجو پر دباؤ ڈالا- اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی-

"میں کہیں آپ کو نہیں چھپاؤں گی-" برجو غصہ سے تن گئی-

"جلدی کرو-----" اور اس نے برجو کے کندھے جھنجھوڑ ڈالے-

"تمہیں معلوم نہیں، میں مرنا پسند نہیں کرتا-"

"تم کمینے ہو-" وہ جھٹکے سے دور کھڑی ہو گئی-

تھوڑی دیر کے لئے وہ غیر فیصلہ کن انداز میں کھڑا رہا- برجو نے اسے غور سے دیکھا- اس کے جسم اور چہرے پر کیچڑ لگی ہوئی تھی- گریبان نیچے تک پھٹا ہوا تھا، اور ایک ٹانگ بالکل برہنہ تھی- باوجود سردی کے وہ پسینہ میں نہایا ہوا تھا- پریشان بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے- اگر وہ اتنا گندہ نہ ہوتا تو اچھی خاصی شکل تھی-

"تم واقعی چاہتی ہو کہ میں مارا جاؤں------ ذرا سوچو' اگر تمہارا اکلوتا بیٹا اس طرح بلا میں پھنس جاتا تو تم کیا اسے ان درندوں کو دے دیتیں تاکہ وہ اس کی بوٹیاں چبا ڈالیں۔" اسے دوازے کی طرف کوئی آتا ہوا معلوم ہوا۔ لپک کر اس نے بجلی بجھا دی اور مضبوطی سے برجو کے کندھے گرفت میں لے لئے۔

"اگر تم بولیں تو میں------" اس نے خوفناک طریقہ پر دانت بھینچ کر کہا "تمہیں بھی میرے ساتھ مرنا ہو گا------ سمجھیں۔"

"اچھا اس پردے کے پیچھے چھپ جاؤ------" برجو مجبور ہو کر بولی۔ وہ خون خچر کے خیال سے لرز گئی۔ آنے والے نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"بی بی!" کسی نے ڈری ہوئی آواز سے پکارا۔

"بالکل خاموش!" گھٹی ہوئی تاریکی میں برجو نے سنا اور کندھوں کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔

"چھپ جاؤ------ پرماتما کے لئے چھپ جاؤ۔" اس نے اجنبی دیوانہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بی بی------ لوگ آ رہے ہیں------" اور ساتھ ساتھ غل بالکل برآمدے میں سنائی دیا۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ انہوں نے ایک آدمی اسی سمت آتے دیکھا تھا۔

"چلو------" میں تمہیں ادھر چھپاؤں گی۔" لیکن جیسے وہ کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ کیونکہ وہ بت کی طرح کھڑا رہا۔

"چلئے!" اس نے ذرا التجا آمیز طریقے پر اسے دھکیلا۔

"نہیں------ تم کہتی ہو میں بزدل ہوں------ میں تمہیں دکھاؤں گا------ دروازہ کھول دو------" وہ دروازہ کی طرف بڑھا۔

"نہیں------ یہ کیا کرتے ہو۔ وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔"

"بلا سے!" اور وہ اسے دھکیلتا ہوا آگے بڑھا۔

"دیا کیجئے------ پرماتما کے نام پہ" وہ اسے روک کر بولی۔

"کیوں؟"

"میں خون نہیں دیکھ سکتی۔"

"ہوں' بڑی خود غرض ہیں آپ! اچھا آپ چلی جایئے------ اور مجھے------"

"نہیں۔ میں آپ کو مرنے نہیں دوں گی۔ جلدی کیجئے۔ وہ لوگ ڈرائنگ روم میں بھی ڈھونڈ چکے' اب ادھر ہی آ رہے ہیں۔"

"میں نے کہہ دیا کہ میں دکھا دوں گا آپ کو۔ یقیناً خوش ہو جائیں گی آپ ہا ہا۔" وہ بیدردی سے ہنسا۔

"میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" برجو سسکیاں بھرنے لگی۔

"یہ خوب زبردستی ہے!" اس نے روٹھے ہوئے بچے کی طرح کہا۔ اور برجو اسے گھسیٹتی ہوئی پردے کے پیچھے لے گئی۔

"خاموش' اگر آپ ذرا ہلے تو وہ دیکھ لیں گے۔" اس نے اس کے کان کے قریب کہا۔

پردہ برابر کر کے اس نے لیمپ جلایا اور جلدی جلدی اس نے وہ کیچڑ اور مٹی جھاڑ دی جو کہ فرش اور قالین پر لگ گئی تھی۔ جلدی سے کھڑکی بھی بند کر دی۔ اور ایک گلدان اور چند کتابیں اٹھا کر وہاں رکھ دیں۔ تاکہ کوئی سمجھے کہ کھڑکی کھلی نہ رہی تھی۔

"کون ہے؟" اس نے دروازہ کھولا۔

دروازے پر اس کی آیا کھڑی کانپ رہی تھی' اور اس کے پیچھے اس کی ماں دوڑی آتی دکھائی دی۔

"بی بی وہ لٹیرے آ گئے------ ناس جائے ان کا' کہتے ہیں کوئی مسلمان آپ کے کمرے میں آ گیا ہے۔"

"میرے کمرے میں!" برجو بن کر بولی۔

"ہاں! انہوں نے اسے دیوار پر چڑھتے دیکھا۔ اور------ اے لو وہ آ بھی

گئے---- آگ لگ جائے ان کو۔" ماں ان کو کوسنے لگی۔

تھوڑی دیر میں یہ معلوم ہوا کہ بر آمدہ نہیں کناری بازار ہے' اور وحشیوں کی سی ہیئت کی چند قحط زدہ شکلیں دروازے میں نظر آئیں۔

"کیا ہے؟" ایک مہارانی کی سی شان سے برجو آگے بڑھی۔

"کچھ نہیں شریمتی جی' ایک ملچھ کو آپ کے کمرے میں ہم نے آتے دیکھا ہے۔"

"میرے کمرے میں!" برجو نے حیرت سے انہیں داخل ہونے کا راستہ چھوڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں" اور بہت ہی عجیب عجیب شکلیں آگے آئیں۔ لیکن ایک ہی لحہ میں انہیں سوائے چند مسحور کن اشیاء کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ وہ لوگ حیرت سے ان عجیب و غریب کرسیوں اور میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو گھورنے لگے۔ تھوڑی دیر کے لئے شکار کو بھول گئے' جو شاید غور سے سنتے تو سانس کی آواز سن لیتے۔

"یہاں کون آتا" برجو نے لرزتے ہوئے دل میں کہا۔

"یہاں کون آتا" ان میں سے شاید ان کا لیڈر بولا۔

"کوئی بھی نہیں" ستھانی نے اطمینان سے کہا۔

ذرا ناامید ہو کر جاتے ہوئے بلوائی یقین دلا گئے کہ وہ محض قومی ہمدردی سے مجبور ہو کر ایک دہشت سے انہیں بچانے آئے تھے۔

اس کی ماں بے طرح گھبرائی ہوئی تھی' اور اسے مجبور کیا کہ وہ چل کر اس کے پاس سوئے یا کم از کم اپنی آیا کو تو پاس سلا ہی لے......!

برجو نے ہنس کر اسے یقین دلایا کہ وہ قطعی نہیں ڈر رہی ہے۔ ڈرنے کی ایسی بات ہی کیا تھی۔ وہی لوگ تھے---- اس نے اپنے حسین کمرے میں آیا کی گودڑی آنے کے تصور کا مذاق اڑا کر بہانہ بنا دیا۔ آیا اسے گزرے زمانہ کی باتیں یاد دلا کر رعب جمانے لگی۔ برجو ننھی سی تھی اور اسی گودڑی میں کس مزے سے سوتی تھی۔

"اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔" وہ ہنسی۔

دروازہ بند کر لینے کی سخت تاکید کر کے اور "دُشنوں" سے بچے رہنے کی دعا دیتی ہوئی بھولی بھالی آیا کے جانے کے بعد برجو پردے کی طرف مخاطب ہوئی جس کے بیچ میں ایک مسخرا چہرہ مسکرا رہا تھا۔

"اب تم فوراً چلے جاؤ۔" اس نے اپنی پہلی سختی سے کہا۔

"ہوں!" اور وہ نہایت اطمینان سے آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"سنا نہیں! اب جانا چاہئے تمہیں۔"

"اوہ ذرا۔۔۔۔۔"

"نہیں اب تم ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتے۔"

"نہیں جاتا میں، بلا لو ان جنگلیوں کو، تم سے تو وہی بہتر تھے۔" اس نے بے بات جھلانا شروع کیا۔

"تمہیں بات کرنا نہیں آتی۔"

"اور تمہیں کون سی بات کرنا آتی ہے۔ ایک پٹے پٹائے بھوکے پیاسے انسان سے یہی سلوک کیا جاتا ہے؟"

"اوہ۔۔۔۔۔ اچھا مگر اس وقت تو تمہیں بھوکا ہی جانا ہو گا۔"

"تو بلا لو انہیں۔۔۔۔۔ بہتر ہے وہ مجھے مار ڈالیں۔" اس نے غصہ سے دانت پیس کر کہا۔ "یہ نہیں دیکھتیں۔۔۔۔۔" اس نے اپنی کہنیاں اور خون آلود گھٹنے دکھا کر کہا۔

"مجھے بڑا افسوس ہے" وہ پانی لینے چلی۔

"اور کیا، ہونا ہی چاہئے" اس نے بڑبڑانا شروع کیا۔

لوٹا برجو کے ہاتھ سے لے کر پہلے تو اسے پی کر بالکل خالی کر دیا اور پھر مانگا۔

"کبھی کسی نے تمہیں لڑکیوں سے بات کرنا نہیں سکھایا۔ ادھر لاؤ اپنا بازو۔" برجو نے کپڑے میں سے زائد پانی نچوڑ کر بزرگانہ لہجے سے کہا۔ مگر اسے ترس آ رہا تھا۔

"ہونہہ------ کوئی کیا بات کرنا سیکھے------ تم لوگ خواہ کیسی ہی بہادر ہو- جہاں کوئی اجنبی آیا اور تم لوگ نئے تیتر کی طرح بھڑکیں- کہو بھلا میں خود مصیبت میں گرفتار ہوں تمہیں کیا نقصان پہونچا سکتا ہوں- مگر نہیں------ تم خود ہی پرلنے دستور پر چلوگی اور ہم لوگ جان نہ پہچان جہاں کسی لڑکی کو مصیبت میں دیکھا اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر پہنچے- اگر تم اس وقت اس طرح گھر جاتیں تو یقین مانو جان دینے میں مجھے عذر نہ ہوتا- مگر تم------"

"دکھتا تو نہیں؟" برجو نے بات بدلنے کے لئے زخم کو کپڑے سے چھو کر کہا-

"قطعی نہیں------ ربڑ کا بنا ہوا ہوں-"

برجو ہنسنے لگی-

اب تو جانے میں کوئی عذر نہیں؟" خون پونچھنے کے بعد کہا-

"اس طرح؟" اس نے اپنے چیتھڑوں کی طرف غصہ سے دیکھ کر کہا-

"تو میری ساڑی اور جمپر پہن جاؤ-" وہ بستر پر بیٹھ کر ہنسنے لگی-

"تمہیں کسی نے لڑکوں سے بات کرنا نہیں سکھایا-" اس نے طعن سے دہرایا-

اور تھوڑی دیر بعد وہ برجو کی سفید ساری کو آدھا اوڑھے اور آدھا لپیٹے جانے کو تیار ہو گیا- اور کھڑکی کھولنے لگا-

"ادھر سے؟"

"اور نہیں تو پھر کھدر سے! تم سمجھتی ہو میں تمہارے گھر کے کونے کونے سے واقف ہوں-" اس نے نہایت برا مان کر کہا-

"پھاٹک سے نکل جاؤ!"

"گور کھے!"

دونوں سوچ میں پڑ گئے-

"ماں کو خبر دینی ہو گی-"

"تم جانو------ دیکھو مارا گیا تو------"

"چپ رہو۔"

"مگر سنو تو------ ادھر کوئی دکھائی نہیں دیتا" اس نے کھڑکی کھول کر جھانکتے ہوئے کہا۔

اور دوسرے لمحے وہ سنسان گلیوں میں سمٹتا بچتا چلا جا رہا تھا۔

بچہ

فساد بڑھتا گیا۔ گورنمنٹ نے دونوں پارٹی کے ممبروں کے بغیر تحقیق جیل میں ٹھونسنا شروع کیا۔ مارنے والا اور پٹنے والا دونوں گئے۔

اسی ہنگامے میں رشید کو پھر اپنی ماں کی بیماری کی وجہ سے نکلنا پڑا۔ شہر کے گلی کوچوں میں معلوم ہوتا تھا۔ سنیما کے سین دکھائے جا رہے ہیں۔ سنسان گلی میں ایک دم بھگدڑ پڑ جاتی تھی' اور پھر وہی موت کی سی خاموشی۔ جھگڑے فساد کے درمیان میں ہی رشید ایک ننھے سے ننگے دھڑنگے بچے کو بلوائیوں کے پیروں سے کچلنے سے بچا کر ادھر ادھر سے بچتا اپنے گھر پہونچا تو ایک اور ہی مصیبت آن پڑی۔ ایک تو ماں بیمار اوپر سے بچہ کا پالنا۔ نوکر بلوے کے سلسلے میں نہ جانے کہاں اڑے ہوئے تھے۔ گھر پر ایک تباہی چھا گئی۔ جھاڑو دینے اور کھانا پکانے اور ماں کی تیمار داری کرنے میں رشید کا دماغ لوٹا جاتا تھا۔ اور جب سے بچہ آیا تھا اس کے اور بھی حواس گم تھے۔ اسے نہلانے دھلانے میں اسے قیامت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بچہ صرف گھٹنیوں چلتا اور کچھ کھا بھی نہ سکتا تھا۔ وہ چار چار دفعہ بچے کو بالکل ایک گلاس کی طرح کھنگال ڈالتا اور پھر بھی میلا ہی رہتا۔ نہانے میں نہ جانے کتنی دفعہ صابن ہاتھ سے پھسلتا کتنی دفعہ بچہ لوٹا اوندھا دیتا اور کتنی ہی مرتبہ خود بچہ ہاتھ سے پھسل کر موری میں جا پڑتا۔

اور پھر اسے کپڑے پہنانا!------ خدا کی پناہ------ رشید نے اپنے سارے بنیان اسے پہنا ڈالے پھر تکیئے کے غلافوں کی باری آئی اور آخر میں اس نے اسے چیتھڑے پہنا کر اوپر سے دھجیوں کی مدد سے ایک کرتہ کی شکل میں جسم پر باندھ

دیا۔ اس کے کمرے میں میلے اور گیلے کپڑوں کے انبار میں بچہ کھیلا کرتا۔ وہ بے چین تھا کہ کب بلوہ ختم ہو اور وہ اس فتنہ کو اس کے ماں باپ تک پہونچا دے۔ مگر ایک بات ہے کہ اس کی خشک کتابوں کی زندگی میں بچہ نے ایک دلچسپ ہلچل مچا دی اور اس کا کام کرنے میں اسے گونہ دلچسپی ہوتی تھی' وہ گھنٹوں اس کے ساتھ اُلٹی سیدھی حرکتیں کرتا اور بچہ بھی بہت مانوس ہو گیا تھا۔ کبھی وہ اس سے نہایت سنجیدگی سے کھانا پکانے اور اس رات کے واقعہ پر ایک طرفہ بحث کیا کرتا تھا۔

بلوہ دب گیا اور گلی کوچے گزرنے کے قابل ہو گئے۔ گو سینکڑوں گھر لٹ گئے اور یتیموں کی تعداد دوگنی ہو گئی۔

رشید نے بچہ کو کسی یتیم خانہ میں دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ کیونکہ وہ اسے سڑک پر لے کر "پائی چیز پرائی چیز" کے نعرے تو لگا نہیں سکتا۔ اسے کچھ افسوس سا ہوا۔ جب وہ بچہ کو ایک تولیہ میں لپیٹ کر یتیم خانے لے گیا۔

"اس کے ماں باپ کون تھے؟" مہتمم یتیم خانے نے پوچھا اور رشید کی لاعلمی ظاہر کرنے پر صاف کہہ دیا کہ "جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ بچہ کسی ہندو کا ہے ہم اسے ہندو یتیم خانہ میں نہیں رکھ سکتے۔ ویسے ہی ہر میں بلوہ ہو چکا ہے اور ابھی ہندو مسلمان کسی طرح بھی ایک دوسرے کی طرف سے مطمئن نہیں ہیں۔"

رشید کو غصہ تو آیا لیکن اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے کسی مسلم یتیم خانے میں دے آئے مگر اس کی حیرت اور غصہ کی انتہا نہ رہی جب ان لوگوں نے اسے مفسدوں کے گروہ کا نمائندہ بتا کر کہہ دیا کہ وہ ان چالوں میں نہیں آئیں گے یتیم خانہ کا معاملہ ہے اگر پھر بلوہ ہو گیا تو یہ معصوم بھی پھنس جائیں گے۔

رشید گھبرا کر بے جواب دیئے باہر نکل آیا اور اس نے بچہ کو لے کر ایک طرف چلنا شروع کیا۔

"اچھا مسٹر اب صاف صاف بتا دو کہ تم ہو کون بلا؟" اس نے بچہ کو پل کی

منڈیر پر بٹھا کر پوچھا بچے نے ہنس کر ایک تھپڑ مار دیا۔

"اے----- میں کہتا ہوں مولانا یہ مذاق کا وقت نہیں۔ بہتر ہے آپ سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور فرمائیں اور صاف صاف اپنی ولدیت مذہب اور ذات پات سے خاکسار کو آگاہ کریں۔ اس نے سنجیدگی سے تھپڑ کی زد سے بچ کر کہا۔

"غوں----- اوں" بچہ ہنستا رہا اور اس کے بٹن کو دانتوں سے پکڑنے کے لئے زور لگانے لگا۔

"اوہ----- اوں" بچہ ہنستا رہا اور وہ بچہ کو اٹھا کر چلنے لگا۔ یہ تو ناممکن تھا کہ وہ بچے کو خود پالنا شروع کر دے۔ گو اب نوکر بھی واپس آگیا تھا۔

وہ دیر تک چلتا رہا۔

"کیوں نہ جس کا مال ہو اسے ہی دیدیا جائے۔" اس نے بچے کو سڑک کے کنارے بٹھانے کا ارادہ کیا' مگر وہ اترنے پر تیار نہ ہوا رشید کو یقین تھا کہ اگر وہ اس طرح بچے سے چھٹکارہ پا جائے تو اسے کوئی نہ کوئی اٹھا ہی لے جائے گا۔ اس نے بہلا پھسلا کر سگریٹ کا ڈبہ اور کاغذ وغیرہ دے کر ایک سنسان سڑک کے کنارے بٹھا دیا۔

اور خود آہستہ آہستہ آگے چلا۔

"ڈا ڈا" بچہ بولا۔ اس کے پاؤں رکے' پھر بڑھا----- بچہ نے منہ بسورا۔

"حضرت میں آپ سے ڈرتا نہیں۔" اور وہ دو قدم اور بڑھا۔

"ہاہا" بچہ رونے لگا رشید کے قدم کسی نے دو سیکنڈ کے لئے روکے----- مگر وہ پھر بھی چلتا گیا۔ اس نے بچے کے رونے کی آواز سے بچنے کے لئے دونوں کان بند کر لئے اور لمبے لمبے ڈگ مارتا چلا----- بچہ اب بھی رو رہا تھا۔ رشید رکا---- واپس مڑا۔ پھر مڑا۔ اور تھوڑی دیر رکنے کے بعد وہ پھر چل دیا۔ مگر اب کے اس سمت جدھر سے بچے کی رحم طلب معصوم آواز آ رہی تھی۔

رشید نے غصہ ہو کر اسے اٹھا لیا۔ تھوڑی دیر غور سے اسے گھورا۔ بچہ بسورا رشید خاموش چلنے لگا۔ بچہ اسے تھوڑی دیر ایسے دیکھتا رہا جیسے روٹھی ہوئی ماں

کو دیکھتا ہے۔ پھر ننھا سا ہاتھ ہوا میں اٹھا اور پورے زناٹے سے رشید کی کنپٹی پر پڑا۔

"بڑے بدمذاق ہیں آپ!" رشید نے ہنسی روک کر کہا۔

دوسرا تھپڑ۔

"اچھا----- اچھا معاف کریئے۔" اس نے بچہ کو کلیجہ سے لگا کر کہا۔

پھر وہی بچہ وہی بیماریاں اور گھر! لیکن اب وہ اتنا سونا نہ نظر آتا تھا وہاں ہر وقت ایک بچے کی کلکاریاں اور ایک نیم پاگل انسان کے قہقہے گونجا کرتے۔ رشید نے اسے پولیس کے سپرد کر دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ مگر وہ انتظار کر رہا تھا نہ جانے کس کا؟ "جب پولیس کو دینا ہی ہے تو پھر دو دن کیا اور چار دن کیا؟" اور دوسرے اسے بچے کو دینے کے لئے کوئی نہایت موزوں وقت بھی تو نہیں ملتا تھا۔

پھر ایک دن برجو اپنی ماں کے ساتھ آئی تو اسے بچہ بڑا دلچسپ نظر آیا دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایسے گھل مل گئے گویا کبھی پہلے ملے ہی نہ تھے۔ برجو نے پہلے تو بچے کے بے ڈھنگے کپڑوں کا مذاق اڑا کر رشید کو خوب جلایا۔

"ہونہہ بچے کا پالنا بھی کوئی کمال ہے؟" اس نے غرور سے جواب دیا۔

"میں اسے پندرہ روز سے بڑے مزے سے پال رہا ہوں۔"

"پندرہ روز سے پال رہے ہیں؟ پندرہ روز؟ کیا کہنے ہیں آپ کے۔" برجو ہنستی رہی "اور جیسے آپ پال رہے ہیں وہ خوب نظر آ رہا ہے----- یہ ----- یہ----- دیکھیئے----- واہ۔" اس نے بچے کے کرتے کا مذاق اڑایا اور بکھری ہوئی چیزوں کو سمیٹنے لگی۔

"آپ تکلیف نہ کریں میں اسے نہلا کر ابھی سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔" اور اسے بڑی احتیاط سے نہلانے لگا۔

برجو کی معترض نگاہوں کے آگے رشید کے آئے حواس چل دیئے۔ کئی دفعہ

بچہ پھسلا اور خود رشید کے کپڑے کیچڑ اور پانی میں ڈوب گئے۔ برجو ہنستے ہنستے لوٹ گئی جس پر رشید اور کھسیا نہ ہو گیا جب بچہ کی آنکھوں میں صابون لگا تو برجو سے نہ رہا گیا اور بے چین ہو کر بڑھی اور بچے کو لے لیا۔

"ہٹئے آپ تو مار ہی ڈالیں گے بچارے کو"

"ہونہ۔ یعنی اتنے دن سے----"

"ادھ موا تو کر دیا" برجو نے بچے کو سلیقہ سے سنبھالتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو گویا آپ بڑی ماہر ہیں' دیکھیں تو آپ کیا کمال دکھاتی ہیں۔" رشید نے اپنے کپڑے نچوڑتے ہوئے ایک طرف ہو کر کہا۔

برجو نے بچے کو نہلا کر بدن پوچھنا چاہا تو رشید بے طرح گھبرا گیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھ کر اپنی قمیض کھونٹی پر سے اتاری۔ کیونکہ کل چادریں اور تولیے کیچڑ میں بھرے کونے میں پڑے تھے۔

"اپنی قمیض سے؟" برجو نے برا مان کر کہا' اور رشید سر کھجانے لگا۔

"لائیے وہ میز پوش!" برجو نے معاملہ کو سمجھ کر طعن سے مسکرا کر کہا۔ جب بچہ نہا چکا تو رشید تازہ دھلا ہوا بنیان لئے بڑے مستعد کھڑے تھے برجو نے صرف نفرت سے بنیان دور پھینک دیا اور بچے کو اسی تولئے میں لپیٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں آج ہی اسے دے آؤں گا۔" رشید نے شکست خوردہ لہجہ میں کہا اور اداس ہو کر بیٹھ گیا۔

"آپ اسے مجھے دید بجئے۔"

"آپ کو---- آپ کیا کریں گی---- میں تو پولیس میں دیدوں گا۔ وہ اسے پہنچا دیں گے اس کے گھر۔"

"اچھا تو ابھی چلئے----- جب تک اس کے ماں باپ ملیں پولیس سے کہہ کر اسے میں رکھوں گی۔"

"آپ کیوں یہ دردِ سر مول لیتی ہیں!" ؟

"یہ درد سر نہیں۔" برجو نے اونگھتے ہوئے بچے کو پیار سے تھپکتے ہوئے

کہا۔

پولیس بچے کے ماں باپ کا پتہ بھی نہ لگا سکی۔ مصیبت کے مارے بلوے کی نذر ہو چکے ہوں گے۔ برجو کا سارا وقت بچے کی دیکھ بھال میں گذرنے لگا۔ رشید وقتاً فوقتاً بچے کو دیکھنے آتا اور دونوں میں کبھی کبھی جھگڑا بھی ہو جاتا۔ بچہ برجو سے ایسا مانوس ہوا کہ رشید کی ساری خوشامدوں کا جواب صرف منہ موڑ کر دیتا۔

برجو اور رشید میں بچے کی طرز پرورش پر بھی بحث ہوتی۔ وہ کہتا کہ یہ فراکیں لڑکوں کو پہنا کر عورتیں مردوں کی جنس پر چوٹ کرتی ہیں، اور برجو اسے وہ تکیہ کے غلاف اور بنیان یاد دلا کر شرمندہ کرتی، جو وہ کبھی بچے کو پہنایا کرتا تھا۔

رشید بچے کو خوب چھیڑتا اور رلاتا جس پر برجو بگڑ جاتی، وہ اسے ہمیشہ برے ناموں سے پکارتا اور برجو کی فرمائش تھی کہ سینما کے مشہور ترین ہیرو کے نام پر اس کا نام رکھے۔ وہ بچے کو پیاری پیاری لوریاں سناتی تو رشید بالکل اس کا الٹا کر کے برجو کو چھیڑتا اور وہ کبھی بگڑ جاتی تو کہتی "آپ ہوتے کون ہیں۔ میرا جی چاہے جو کچھ کروں۔ میرا بچہ ہے۔۔۔۔۔!"

"خوب! اور کیا میرا بچہ نہیں ہے؟ آپ کو بگڑنے کا کیا حق"

"یہ میں کب کہتی ہوں کہ آپ کا نہیں۔" بھولپن سے برجو بولی۔" دونوں کا ہے!"

"دونوں کا!" رشید نے امید و بیم کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کر پوچھا۔ برجو کا سر جھک گیا۔۔۔۔۔ اور وہ بچے کو لے کر دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔

قوم نے پھر جاگنا شروع کیا۔ بہت جلد چند معزز ہستیوں کو پتہ لگ گیا کہ ایک "مسلمان" بچہ ہنود کے یہاں پرورش پا رہا ہے، ہندوؤں کو بھی فوراً اس بچہ کی حمایت میں اٹھنا پڑا کیونکہ انہیں یقین تھا کہ بچہ کسی اونچی ذات کا ہندو ہے۔ دونوں

کا خوف اور "اسلام خطرہ میں" ہونے کا خیال ظاہر کیا گیا۔ قوم کے سب سے بڑے خدمتگار یعنی ایڈیٹر گلا پھاڑ پھاڑ کر اٹھنے لگے اور پھر جلسے ہوئے جن میں اس بچے کے مذہب کے خطرے میں ہونے کی وجہ سے ہندوستان کی تباہی کے آثار نظر آنے لگے۔ وہی بچہ جسے ہندو مسلمان دونوں نے دھتکار دیا تھا اگر اپنی اور ہم انجام ہستیوں کی طرح سڑک پر کتوں کے ساتھ جھوٹے ٹکڑوں اور چچوڑی ہڈیوں کے پیچھے لڑ کر کسی روز خاموشی سے سڑک پر ہی آخری سانس لے لیتا تو کچھ نہ تھا۔ پر یوں اس کے دھرم گت اور اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان بھر کے مذہب کا زوال یقینی تھا۔ بھلا کس سے دیکھا جاتا۔ معاملہ اور بڑھا دونوں فریقوں نے لاتعداد گواہ اس بچے کے مذہب کو ثابت کرنے کے لئے مہیا کر دیئے مگر رسی کھینچتی ہی رہی۔ دونوں طرف زور شور سے چندے جمع کئے جانے لگے اور باقاعدہ فنڈ قائم ہو گئے جو شاید کسی زلزلہ زدہ شہر کے لئے بھی نہ کئے جاتے اور جب کہ نہ جانے کتنے ہی معصوم مذہب سے دور، جن کا دھرم صرف غربت تھی فاقہ کشی میں گھرے ہوئے تھے لاکھوں روپیہ وکیلوں اور گواہوں کی جیبوں میں انڈیلا جا رہا تھا۔ یہ تو ہوئی ایک ملک کی مذہب پرستی۔

جو کبھی فیصلہ ہندوؤں کے موافق ہوتا تو فوراً اسلامی جھنڈے ہوا میں لہرانے لگتے۔ اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے سوتی قوم کو جگا دیا جاتا۔ روپیہ کی بوچھاڑ ہوتی اور بچہ دوسری پارٹی کی طرف منتقل ہو جاتا۔ لیکن فوراً ہی تلک دھاری پنڈت اور قوم کے موٹے موٹے لیڈر آکاش کا کل دیوتاؤں کو تڑپ تڑپ کر پکارتے اور بچہ پولو کی گیند کی طرح کبھی ادھر کبھی ادھر لڑھکا دیا جاتا۔ انسانی زندگی کا یہ کھیل انتہائی دلچسپی پر پہونچ گیا۔

معاملہ اور بھی نازک ہو گیا۔ برجو نے صاف انکار کر دیا کہ ثبوت ملنے سے پہلے وہ کسی طرح بچے کو جدا نہ کرے گی۔ اس کے ماں باپ انتہا سے زیادہ پریشان تھے۔ انھوں نے بہت سمجھایا کہ چولھے میں ڈالے بچے کو۔ اس سے دست بردار ہو جائے۔ مگر وہ ایک ضدی بچی کی طرح اڑ گئی۔ بچے کی محبت، عوام کی زیادتی کہ وہ

اس کے پیچھے فضول لڑ رہے تھے اور اوپر سے اس کی ضدی طبیعت' ان تینوں چیزوں نے مل جل کر اسے دیوانہ بنا دیا۔ یہاں تک کہ وہ رشید کے سمجھانے پر اور بگڑ گئی۔

اسے پرواہ نہ تھی کہ فیصلہ ہندوؤں کے موافق ہو یا مسلمانوں کے۔ وہ تو صرف بچے کو چاہتی تھی۔ اور آخر اس کے صبر کی انتہا ہو گئی۔ جب بچے کو ایک پارٹی کے حق میں مکمل فیصلہ ہو جانے کی وجہ سے اس سے درخواست کی گئی کہ وہ بچے کو فوراً دیدے۔

"کبھی نہیں یہ میرا بچہ ہے۔" اس نے باؤلوں کی طرح چیخ کر کہا۔

"تمہارا بچہ!" وکیل نے دھوکا کھا کر جرح کی۔

"میں نہیں دونگی" وہ کچھ مجبور ہو کر اور بھی دیوانی ہو گئی۔

"تمہیں ثبوت دینا ہو گا کہ یہ تمہارا بچہ ہے۔"

"برجو نے پریشان ہو کر سر جھکا لیا۔ واقعہ ایک نئی صورت میں تبدیل ہو گیا۔

"کیا کوئی ماں یہ ثبوت دے سکتی ہے کہ اس کا بچہ اسی کا بچہ ہے۔"

دوسرے وکیل نے کہا "ثبوت یہی ہے کہ وہ اس کی ماں ہے اور وہ اس کا بچہ۔"

کچہری میں غلغلہ مچ گیا۔ برادری کی لاج اور بدنامی کا خاکہ اڑنے لگا۔ لالہ جی نے چاہا وہ اسے زبردستی گھر لے جائیں۔ مگر برجو پر ضد بری طرح سوار تھی۔

"نہیں میں اسے نہیں دونگی۔" اس نے بچے کو چمٹا کر کہا۔

"آپ دیکھتے نہیں کہ بچے کے جدا کرنے کے خیال سے ہی لڑکی کی حالت غیر ہو جاتی ہے اور پھر بھی آپ ثبوت مانگتے ہیں۔ دیکھئے ذرا دیکھئے کیا اب بھی آپ کو کوئی شک ہے؟" وکیل نے کہا اور ممتا کا ایک دل دوز سین دیکھ کر سب کے سر معنی خیز طور پر ملنے لگتے۔ کئی آنکھوں میں تو آنسو آ گئے۔

"مگر تمہیں ثبوت دینا ہو گا! اس کا باپ کون ہے؟" جج کی بھاری آواز

گونجی۔

"باپ؟" بَرجو نے گھبرا کر کہا۔

"میں نہیں جانتی۔" برجو نے ہارتے ہوئے کہا اور اس کی آنکھیں بھر آئیں اور سر جھک گیا۔

"ظلم ہے، یہ صریحا" ظلم ہے، آپ ایک شریف لڑکی سے اس کے ناجائز بچے کے باپ کا نام پوچھتے ہیں۔" بکواسی وکیل بولا۔

"یہ جھوٹ ہے۔" لالہ جی تڑپ کر بولے۔

"ہر باپ کو بیٹی کے ایسے معاملہ کو جھوٹ کہنے کا حق ہے۔" وکیل بڑبڑایا۔

معاملہ کی عجیب و غریب ہئیت کو دیکھ کر برجو بدحواس ہو گئی۔

"یہ میرا بچہ نہیں۔" اس نے ذرا تیز ہو کر کہا۔

"ہا---- چچ چچ----- غریب لڑکی----- غرت کے آگے ماتا کچلی جا رہی ہے۔" وکیل نے تاسف اور درد بھرے لہجہ میں کہا۔

برجو نے بچے کو علیحدہ کرنا چاہا لیکن وہ اسے چمٹ گیا۔ برجو اور بھی پریشان ہوئی وکیل کی ہمت بڑھی۔

"بیسویں صدی میں ایسی بھی مائیں ہوتی ہیں۔ کیا تم اس بچے کو یتیم خانہ میں چھوڑ دو گی تاکہ وہ قوم کے ناکارہ فرد کی طرح بڑا ہو----- کیا تمہارا دل اس ناانصافی کو قبول کرے گا۔" وکیل بے بات برجو سے الجھ پڑا اور یتیم خانوں کی دردناک حالت کا ذکر کر کے اس نے اسے ہلا دیا۔ اس نے بچے کو پیار سے اپنے قریب کر لیا۔

"میں اسے نہیں چھوڑ سکتی۔" اس نے خود سے کہا۔

"کوئی ثبوت، کوئی اور ثبوت؟ یہ بچہ تمہارا ہے، بشرطیکہ تم اس کے باپ کا نام بتاؤ۔" برجو کے خاندان والوں کی چیخ پکار کے درمیان جج نے فیصلہ کیا۔

برجو کا سر جھک گیا اور جب اس کی شکست خوردہ آنکھیں دوبارہ اٹھیں تو رشید کے چہرے پر پڑیں جو پہلے ہی سے پریشان اور گھبرایا ہوا تھا۔ خاموشی سے

لوگوں میں اشارے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا گیا اور معاملہ صاف نظر آیا۔

رشید بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا۔ برجو نے بچے کو چھوڑ دیا اور وہ رینگتا ہوا رشید کے پاس جا پہنچا۔ محبت کا یہ دردناک سین دیکھ کر لوگوں کو بے اختیار آنسو چھپانا پڑے۔

اور پھر غیب سے فرشتوں نے دیکھا کہ دو ہاتھ ایک رجسٹر پر کچھ لکھ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک ہاتھ برجو کا تھا اور دوسرا رشید کا۔

اب بھی ان دونوں میں بچے کی وجہ سے ویسی ہی دلچسپ لڑائیاں ہوتی ہیں۔

"میرا بچہ" دوسرا ضد کرتا ہے۔

"ہم دونوں کا بچہ!" دونوں اتفاق رائے سے فیصلہ کرتے ہیں۔
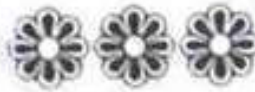
بھول بھلیاں

"لفٹ رائٹ' لفٹ رائٹ۔ کویک مارچ!" اڑا اڑا دھم!! فوج کی فوج کرسیوں اور میزوں کی خندق اور کھائیوں میں دب گئی اور غل پڑا۔

"کیا اندھیر ہے۔ ساری کرسیوں کا چورا کیے، دیتے ہیں۔ بیٹی رفیعہ ذرا ماریو تو ان مارے پیٹوں کو۔" چچی ننھی کو دودھ پلا رہی تھیں۔

میرا ہنسی کے مارے برا حال ہو گیا۔ بمشکل مجروحین کو کھینچ کھانچ نکالا۔ فوج کا کپتان تو بالکل چوہے کی طرح ایک آرام کرسی اور دو اسٹولوں کے بیچ میں بچا پڑا تھا۔

"آں...... آں صلو بھیا نے کہا تھا فوج فوج کھیلو۔" رشید اپنی کاغذ کی ٹوپی سیدھی کرنے لگے اور منو اپنے چھپے ہوئے گھٹنے کو ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے گھور گھور کر بسور رہے تھے۔ اچھن چچا جان کے کوٹ میں سے باہر نکلنے کے لئے پھڑپھڑا رہے تھے اور ان کا مفلر بری طرح پھانسی لگا رہا تھا مگر کپتان صاحب ویسے ہی ڈٹے کھڑے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا تھا؟" میں نے کپتان صاحب کی سیاہی سے بنی ہوئی مونچھوں کو دیکھ کر کہا۔

"صلاح الدین اعظم رچرڈ شیر دل پر چڑھائی کر رہا تھا۔ منو کو ہنسی آ گئی اور وہ لیٹ گیا۔ پھر کالی کرسی کھسک گئی اور بس" کپتان صاحب نہایت احتیاط سے مونچھیں تھپکتے ہوئے بولے۔

"اچھا۔ اور یہ اچھن

"یہی تو رچرڈ ہیں اور کیا' شیر دل' یہ مفلر دیکھو ان کا' یہ شیر دل کے بال ہیں۔"

"اور جناب؟" میں نے چار فٹ کے کپتان کو نظروں سے ناپا۔

"ہم صلاح الدین اعظم۔" وہ اکڑتے ہوئے چلے۔

"اور بھئی یہ میرا کوٹ اتار دو سیاہی لگ گئی تو خدا کی قسم ٹھوکوں گی۔"

"اوہو آپ کا کوٹ۔ بات یہ ہے کہ اس کے بالوں دار کالر کو...... تو لیجئے نا اپنا کوٹ۔"

"رفو باجی' ذرا یہ سوال بتا دیجئے۔" صلو اپنی سلیٹ میری ناک کے پاس اڑا کر بولے۔

"نا بھئی میں اس وقت سی رہی ہوں ذرا۔"

"پھر ہم آپ کو سینے بھی نہیں دیتے۔" صلو نے میرے پیروں میں گدگدیاں کرنا شروع کیں۔

میں نے پیر سمیٹ لئے تو وہ میری کمر میں سر اڑا کر لیٹ گیا اور بکنا شروع کیا۔ "پھٹ جائے اللہ کرے۔ جھر جھر ہو جائے یہ کرتا۔ سوال تو بتاتی نہیں لیکے کفن سیئے جا رہی ہیں اپنا۔"

"چل یہاں سے پاجی ورنہ سوئی اتار دوں گی۔" اور وہ وہاں سے ہٹ کر میری البم الٹ پلٹ کرنے لگا۔

"یہ کون ہیں چڑیل جیسی ...... کالی مائی...... اور یہ ...... یہ......"

"صلو بھیا رکھدے میری چیزیں۔" میں نے سوچا جن ہے یہ تو۔"

"تو پھر سوال بتاؤ۔" اور وہ میرے پاس گھس کر بیٹھ گیا۔

"تلوے ذرا ہٹ کر گرمی کے مارے ویسے ہی ابلے جا رہے ہیں۔"

"تو میں کیا کروں۔" اور وہ مجھ سے اور لپٹا۔

"میری باجی کیسی ------ ہاں گڑیا ذرا بتا دو پھر سوال۔"

مجبوراً میں نے سوال کرنا شروع کیا۔

"اب یہ سوال سمجھ رہا ہے یا میرے بندوں کا معائنہ ہو رہا ہے۔" اور وہ جلدی سے سلیٹ پر جھک گیا۔ میں بتا رہی تھی اور وہ بیوقوفوں کی طرح میرا منہ دیکھ رہا تھا۔

"اونہہ" میں چڑ گئی۔ "پڑھ رہے ہو یا منہ تکنے آئے ہو' صلو دق نہ کرو۔ ورنہ چچی جان سے کہہ دوں گی۔"

"آپ کی تصویر بنا رہا ہوں۔ یہ دیکھئے آپ کے ہونٹ بولنے میں ایسے ہلتے ہیں جیسے.... جیسے پتہ نہیں کیا۔ بس ہلتے رہتے ہیں-----" شرارت سے آنکھیں مٹکائیں۔

"بھاگ یہاں سے الو۔" میں نے سلیٹ دو پھینک دی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا الگ بیٹھ گیا اور میں اٹھ کر برآمدے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد دیکھتی ہوں کہ چلے آ رہے ہیں اپنا بستر بوریا سنبھالے۔ یا اللہ خیر!

"کیوں تم پھر آ گئے یہاں۔"

"اور کیا۔ وہاں دل جو گھبراتا تھا۔" اور وہ میرے پاس بیٹھنے لگا۔

"صلو! اگر تم مانو گے نہیں تو......"

"تو...... تو...... ای......" اس نے منہ چڑایا۔ "ہم تمہارے پاس بیٹھتے ہیں تو اچھا پڑھا جاتا ہے۔"

"اچھا تو چپکے بیٹھو۔"

صلاح الدین میرے چچا کا اکلوتا سپوت تھا۔ پھوٹی آنکھ کا ٹیکہ تو ایک تارا تھا۔ اتنی لڑکیاں پیدا ہوئیں کہ چچا چچی بولا گئے۔ اور پھر آپ تشریف لائے۔ جناب کی انگلی دکھے تو بکرے صدقے کئے جانے لگیں۔ منتیں مانی جائیں۔ گھر میں کوئی زور سے نہ بولے۔ جوتے اتار کر چلو۔ برتن نہ کھڑکے۔ لاڈلے کی آنکھ کھل جائے گی۔ گھر میں اسی لئے کوئی کتا نہ پلتا۔ مرغیاں نہ رکھی جاتیں کہ ننھے میاں کی کبھی نیند نہ خراب کر دیں اور ہم بیچارے نہ لاڈ جائیں نہ لاڈ کریں۔ پھر بھی ماں بہنوں کا لاڈ

اسے کڑوا لگنے لگتا تھا اور وہ سارے وقت مجھ سے الجھتا لوگوں کے "نان وائلنس" سے وہ تنگ آ گیا تھا۔ یہی بات تھی کہ وہ جان جان کر مجھے چھیڑتا۔ کیونکہ میں اسے بری طرح ڈانٹ دیتی اور کبھی کبھی چپت بھی رسید کر دیتی۔

لاڈلے پوت دبلے اور سوکھے تو ہوتے ہی ہیں اور اوپر سے پتلا بانس جیسا قد اماں تو نظر بھر کے نہ دیکھتیں۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں اونٹ صاحب کو نظر نہ لگ جائے اور یہاں یہ کہ جہاں لمبی لمبی ٹانگیں پھینکتے آئے اور چھیڑے گئے۔ یہ عادت سی ہو گئی تھی کہ کالج سے آئے اور اماں کو بلائیں دے کر اور دادا کو نبض دکھا کر سیدھے میری جان پر نزول۔ کیا مجال جو گھڑی بھر نچلا بیٹھے یا بیٹھنے دے۔ بہنوں کو چھیڑنا کسی کے گدگدی کی، کسی کے گلے میں جھول گئے، کسی کے کندھے میں کاٹ لیا۔ میرے پاس آئے اور میں نے تھپڑ دیا۔

گھنٹوں ماں بہنیں بیٹھ کر ارمان بھرے ذکر کیا کرتیں۔ ہر دلچسپ اور پُر مسرت بات صلو میاں کی شادی کے لئے اٹھا کر رکھ دی جاتی۔

"صلو کی شادی میں بناؤں گی سب کی گوالیر کی چندیری کی ساڑھیاں اور بھئی میں تو دہلی جا کر کروں گی سہیل کی شادی۔"

"اور اماں اسے بلائیں گی لیلا ڈیسائی کو ناچ کے لئے۔" ایک بہن بولی۔

"بھئی ہم تو سہرا وغیرہ سب باندھیں گے۔ زربفت کی اچکن ماموں ابا جیسی اور......"

بہنوں کے لئے بھائی تھا گویا جگمگاتا ہوا ہیرا! میری اندھی آنکھوں میں جیسے اور چھ سات بھائی تھے یہ بھی ایک لڑنے جھگڑنے، تو تو میں میں کرنے اور بات بے بات رعب جمانے والی ایک ادنیٰ ہستی تھی میں ان کے ارمان بھلے دلوں کے بھڑکتے ہوئے جذبات سے کملا جاتی۔ کاش میرے بھی اتنے بھائیوں کے بجائے ایک ہی ہوتا۔ ایک دبلا پتلا، آئے دن مریض چیخنا، لڑاکو، کتنا رومنٹک ہوتا۔

"باجی ذرا کرتے میں یہ بٹن ٹانک دو۔" وہ اپنی پتلی گردن آگے بڑھا کر بولا۔ "جھٹ پٹ ٹانکو، مجھے میچ میں جانا ہے" ---- میں ناول کے ایسے حصے میں پہنچ گئی

تھی۔ جہاں ہیرو ہیروئن کے بازوؤں تک پہنچ چکا تھا۔ بھلا اس قدر غیر رومانی کام میں میرا کیا جی لگتا۔

"رابعہ سے کہو وہ ٹانک دے گی۔"

"نہیں ہم تو تم ہی سے نکوائیں گے۔"

"میرے پاس سوئی بھی نہیں۔"

وہ دوڑ کر چچی جان کی بقچی اٹھا لایا۔ "لو یہ سوئی۔"

"تاگہ پرو۔"

"لاؤ میں پرو دوں۔" چچی سروتہ چھوڑ کر بولیں۔

"میں تو انہیں سے نکواؤں گے۔" "لو سوئی۔"

مجھے ضد آ گئی "راشدہ سے نکواؤ" ہیرو آگے بڑھ رہا تھا مجھے آخری لائنیں پھر سے پڑھنا پڑیں۔

"نہیں ہم تو تمہیں سے نکوائیں گے۔ رکھو کتاب ادھر' ورنہ پھاڑ دوں گا۔"

"پھاڑی' بھاگ جاؤ نہیں ٹانکتے۔۔۔۔۔" میں نے کتاب دوسری طرف موڑ لی اسے بھی ضد آ گئی۔

"آج یا تو تم سے بٹن نکواؤں گا یا اپنا تمہارا خون بہا دوں گا۔"

"چل ہٹ بڑا وہ ہے نا۔ بہاؤ نا بہاؤ اپنا خون۔"

ہیرے کی کنی کے خون بہانے کے ارادہ ہی کو دیکھ کر بھنویں لرز گئیں ان کا بس چلتا تو وہ بٹن کی جگہ اپنی آنکھیں ٹانک دیتیں۔

"صلو لاؤ میں ٹانک دوں ذرا سی دیر میں۔" راشدہ بولی۔

"کہہ دیا صلاح الدین اعظم ایک جو کہہ دیتے ہیں وہ ٹلتی نہیں ------
دیکھو باجی ٹانکتی ہو یا......"

"یا کیا؟" میں نے تیوریاں چڑھائیں۔

"یہی کہ میچ دیکھنے نہیں جاؤں گا اور ایک لفظ کتاب کا نہیں پڑھنے دوں گا اور موقع ملنے پر کتاب پار کر دوں گا۔۔۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔

"اوہو۔ لو بس تو پھر پیاری سی بچو کی طرح ٹانک دو۔"

میں نے بھی سوچا وبال کاٹو۔ میں نے تو بٹن ٹانکنا شروع کیا اور وہ مجھے دق کرنے لگا۔

"دیکھو صلو میرا ہاتھ ہل جائے گا تو سوئی کلیجہ میں اتر جائے گی۔"

"اتر جانے دو۔" اور اس نے پھر گدگدی کی۔

میں نے سوئی مذاق میں چبھونا چاہی۔ وہ جلدی سے ہٹا۔ دھکے سے نہ جانے کیسے سوئی کی نوک چبھ گئی خون بھی نکلا اور غضب یہ کہ نوک غائب سنتے ہیں کہ سوئی کی نوک خون میں کھو جاتی ہے دل میں جا پہنچتی ہے۔ دم نکل جاتا ہے۔

"ارے نوک" میرے منہ سے پریشانی میں نکلا۔

"میرے سینے میں اتر گئی اور اب خون میں چلی جائے گی۔ اور پھر...... پھر دل میں آ جائے گی لو اماں جان ہم تو چلے۔"

چچی جان کو سکتہ ہو گیا مگر وہ سنبھلیں اور چیخیں۔ رابعہ چیخی اور راشدہ چیخی۔ میرا یہ حال کہ مجرم کی طرح سوئی پکڑے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ صلاح الدین سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور لاچاری سے گریبان ٹٹولنے لگا۔

پھر جو ہلڑ مچا ہے تو خدا ہی جانتا ہے کہ مجھ پر کیا کچھ گزری۔ ڈاکٹر، حکیم اور نمازیں اور میرا دل چاہے ڈوب مروں۔ آخر میں نے مذاق کیا ہی کیوں، اور وہ بھی اس کانچ کے گلاس سے------

کیا بتاؤں کیسی پشیمانی ہو رہی تھی۔ ایکس رے ہوا۔ سارے جسم میں سوئی ڈھونڈ ڈالی مگر خاک پتہ نہ چلا اور بھی مصیبت۔

چچی جان کے آنسو اور رابعہ، راشدہ کا ٹہل ٹہل کر دعائیں مانگنا اور اوپر سے صلو کا اترا اترا کر مرنے کی دھمکیاں دینا۔ میرے آنسو نکل آئے۔ صلو نے میری طرف دیکھا اور مسکرایا۔

"اب تو چین آ گیا ہے آپ کو۔"

میں نے سر جھکا لیا۔

"اچھا یہاں آیئے۔ ذرا میرے سر میں تیل تھپک دیجئے۔"

بھلا اب مجھ میں ہمت کہاں تھی جو انکار کروں۔ چپ چاپ سر میں تیل ڈالنا شروع کیا۔ صلو فتح مندانہ انداز سے مجھے آنکھیں چڑھا چڑھا کر دیکھتا اور مسکراتا رہا۔

"دیکھا میرا حکم نہ ماننے کا نتیجہ!" وہ میری انگلی میں چٹکی نوچ کر بولا۔ "سوئی تو میرے گریبان ہی میں رہ گئی تھی۔"

غصہ کے مارے میرا خون کھول گیا۔

"اچھا جانے دو۔ اماں جان کاہے کو مانیں گی۔ میں نے سوئی پھینک بھی دی۔ "میرے ہاتھ پھر ڈھیلے پڑ گئے اور وہ اور ہنسا۔

"اچھا باجی تجھے بھی اس کی سزا نہ ملی تو...... خیر۔" میرا جی چاہا اس کے بال نوچ کر دور ڈھکیل دوں۔ "خدا سمجھے......"

"مجھے تم سے کام کروانے میں مزا آتا ہے جب میں نوکر ہو جاؤں گا تو تمہیں اپنے پاس رکھوں گا۔"

"ہوش میں، میری جوتی رہتی ہے تیرے پاس۔"

"دیکھ لینا۔ میں تمہیں لے لوں گا---- گود لے لوں گا---- ہنستی کیوں ہو۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔

"اور پھر تمہیں ہوائی جہاز میں بٹھاؤں گا۔ ہاں......" وہ آنکھیں گھما کر بولا۔

میرے امتحان کے دن آ گئے تھے اور میں کمرہ بند کر کے پڑھا کرتی تھی مگر صلو کہیں مانتا تھا جہاں میں پڑھنے چلی اور وہ بھی موجود ہیں۔ میں نے سنجیدگی سے منع کر دیا کہ "اگر تم نے دق کیا تو میں بورڈنگ چلی جاؤں گی۔ پڑھنے کے خیال سے

چچا میاں کے گھر رہنا پڑا تھا۔

وہ خاموش پڑھا کرتا۔ مگر گھنٹہ آدھ گھنٹہ بعد بے چینی ہونے لگتی۔

"اب بھائی انٹرول ہو گا۔" وہ کتاب بند کر کے میرے پاس آن گھستا اور دس منٹ تک وہ اودھم مچتا کہ خدا کی پناہ۔ شرارت میں اسے کاٹنے کا مرض ہو گیا تھا۔

"بات یہ ہے کہ جی چاہتا ہے کہ تمہیں کھا جاؤں۔" وہ ہنس کر دانت پیستا۔

"خود اپنی بوٹیاں چبا ڈالو۔" مگر وہ بری طرح لپٹ جاتا اور باوجود دھکیلنے کے تنگ کئے جاتا۔ کبھی مجھے غصہ آ جاتا لیکن عموماً اگر وہ کمرہ میں نہ ہوتا تو کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی۔ گھر کی ساری چہل پہل اسی ایک انسان کے دم سے تھی۔ بچوں کو چھیڑنا، بہنوں کو رلانا، کبھی پھر فوراً لپٹ کر پیار کرتا اور منا لیتا۔

امتحان ختم ہو گئے اور گھر جانے کے خیال سے خوشی کے ساتھ ساتھ دکھ بھی ہو رہا تھا۔

"کیوں جا رہی ہو چھٹیوں میں۔" وہ ایک دن بولا۔

"واہ میری اماں بیچاری اکیلی ہیں۔"

"اکیلی! جیسے انہیں بڑی تمہاری پروا ہے۔"

"ہوں، اور نہیں تو تمہیں پروا ہو گی۔"

وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ "سچ کہتا ہوں بجو...... سچ کہتا ہوں تم نہ جاؤ۔" اس نے پیار سے میرے کندھے پر سر رکھ دیا اور اپنی سوکھی باہیں میرے گلے میں حمائل کر دیں۔

"ہٹو تو...... خیر ہو گی تمہیں میری پروا۔ مگر اب تو جاؤں گی۔"

"مگر میں کہتا ہوں مت جاؤ۔" وہ ذرا ہٹ کر بولا۔

"بکواس مت کرو۔ جاؤ ذرا کسی کو بھیجو میرا سامان باندھ دے۔"

"اور میں کہتا ہوں تم نہیں جا سکتیں۔"

"ہنھ! بڑے لاٹ صاحب ہوتا جو روک لو گے۔"

"یاد ہے وہ سوئی۔" وہ شرارت سے مسکرایا۔
"مکار ہو تم...... کہیں کے۔"

دوسرے دن صلو کو بخار چڑھا۔ سارے گھر جیسے آفت ٹوٹ پڑی۔ ذرا سا ملیریا اور یہ اودھم مگر دم مارنے کی اجازت نہ تھی۔

"اماں جان بجو کو روک لیجئے آپ سے اکیلے تیمار داری نہ ہو سکے گی۔" جیسے سور کو بڑی تیمار داری کی ضرورت تھی۔

"ارے میاں بھلا وہ کیوں رکیں گی۔" چچی اماں طعن سے بولیں۔ "میں حمیدہ کو تار دے کر بلا لوں گی۔"

"نہیں اماں وہ اپنے بچے لے کر آن دھمکیں گی تو اور غل مچے گا۔ بجو تو خود رک رہی تھی۔ اسکول میں پارٹی ہے۔ دوسرے جب ہم اچھے ہو جائیں گے تو سنیما دیکھنے چلیں گے۔"

"رک جاؤ نا کیا ہرج ہے۔" رابعہ نے رائے دی۔ اسے چڑیل کو کیا پتہ کہ یہ مکاری کر رہا ہے۔ بخار تو اتفاق سے آ گیا۔ ورنہ وہ کچھ اور فیل مچاتا۔ رکنا ہی پڑا۔

"صلاح الدین اعظم کا حکم۔" وہ شرارت سے مسکرایا۔ "میرے مونچھیں نکل آئیں تب تمہارے اوپر اصلی رعب پڑا کرے گا۔ لو اسی بات پر ذرا سی برف کچل کر تو کھلا دو۔" چچی جان نے اس قدر ڈری ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا کہ میں جلدی سے تولیہ میں برف توڑنے لگی۔ کسی کا لاڈلا ہو تو ہم کیوں بھگتیں مگر وہ تو بھگتنا ہی پڑا۔

"بجو...... بجو......" کسی نے آہستہ سے مجھے پکارا۔
"کیا ہے۔" میں ڈر گئی۔
"ذرا سا پانی۔" صلو نے اپنے پلنگ سے ہاتھ ہلا کر کہا۔ میں جلدی سے اٹھی۔ اندھیرے میں تھرماس ٹٹول کر پانی نکالا۔

"اماں تھکی ہوئی ہیں...... بیٹھ جاؤ۔" اس نے سرہانے مجھے بٹھالیا اور آہستہ آہستہ گلاس میں برف ہلانے لگا۔

اسے بری طرح پسینہ آرہا تھا اور ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ پانی پی کر وہ میری گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

"بجو"

"کیا ہے۔"

"میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

"چچی جان کو جگاؤں۔" میں نے چاہا آرام سے اس کا سر تکیہ پر رکھ دوں۔"

"نہیں...... ہلو مت!" اس نے اپنے پتلے پتلے ہاتھ میری کمر میں ڈال دیئے۔" دل گھبرا رہا ہے بجو۔" وہ تیزی سے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے اپنے کو چھڑانے کی کوشش نہ کی اور اس کی پیشانی پوچھنے لگی۔ وہ اور بھی پریشان ہو گیا۔ اس نے جلدی جلدی میرا نام لے کر بڑبڑانا شرع کیا۔ سبکیاں! وہ سبکیاں بھرنے لگا۔ عجب سوکھی سوکھی اکھڑی ہوئی سانسیں۔ میں سمجھی نہ جانے کمبخت کو سرسام ہو گیا یا کیا اور اسے لٹانے کی کوشش کرنے لگی۔

"بجو جاؤ مت...... میں مر جاؤں گا۔" اور بری طرح بچوں کی طرح مجھ سے لپٹ گیا اور اس کی آنکھیں! وہ جیسے...... نہ جانے آج مجھے ان آنکھوں میں کیا نظر آرہا تھا میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ شوخی سے تھرکنے کے بجائے چڑھی ہوئی اور گہری تھیں۔ کچھ پاگل سی، کچھ عجیب! مجھے تھوڑی دیر کے لئے یہ معلوم ہوا گویا اندھیرے پیچ دار راستوں میں پریشان چکر لگا رہی ہوں اور کوئی دروازہ نہیں ہے

کوئی قریب کے پلنگ پر کلبلایا اور وہ جلدی سے چونک پڑا۔ "جاؤ...... رابعہ جاگ گئی!" اس نے خوفزدہ ہو کر مجھے دور دھکیل دیا۔ "جاؤ جلدی۔" وہ خود دوڑ کر چادر میں چھپ گیا۔

میں پریشان ہو گئی۔ یا اللہ کیا واقعی یہ پاگل ہو رہا ہے!" رابعہ جاگ گئی! تو کیا ہوا؟ مجھے چچی جان پر رحم آنے لگا۔ خدا نخواستہ...... خیر......"

اور اس کے بعد اس میں ایک غیر معمولی انقلاب ہو گیا۔ وہی رات والی پاگل گہری اور چڑھی ہوئی آنکھیں بغیر بخار اور ہذیان کے کچھ عجیب ہوتیں وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ چھیڑنے اور چڑانے لگا مجھ سے ہر وقت الجھتا اور پھر بالکل پاگل ہو جاتا وہ میرے قریب میں رہنے کے بہانے تراشتا۔ ہر جگہ ہر کمرے، ہر موڑ اور ہر کونے پر وہ میری تاک میں مجھے ڈرانے اور گدگدانے کے لئے چھپا رہتا۔ میں اس کی ضرورت سے زیادہ توجہ سے کبھی بے طرح پریشان ہو جاتی اور کبھی مجھے وہ سب ایک الھڑ لڑکے کی شرارتیں معلوم ہوتیں اور یہ شرارتیں کس تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔

دو سال بعد جب میں رابعہ کی شادی پر آئی تو صلو کو صلاح الدین اعظم کہنا پڑا۔ افوہ ایک چھوٹا سا لچکتا ہوا کملایا سا پودا نوخیز درخت بن گیا تھا۔ خون کی حدت سے چہرہ سانولا ہو گیا تھا۔ اور پتلے سوکھے زرد ہاتھ سخت گٹھلیوں دار مضبوط شاخوں کی طرح جھلسے ہوئے بالوں سے ڈھک گئے تھے اور آنکھیں تو بخدا بالکل پاگل ہو گئی تھیں پتلیاں ناچتی بھی تھیں اور ایک دم سے جم کر گہری ہو جاتیں کہ فوراً آنکھ جھپک جائے۔

"بجو، کچھ میری مونچھوں کا رعب پڑتا ہے۔"

"خاک! اس قدر کمری شکل ہو گئی ہے۔"

"اور تمہاری بڑی بھولی ہے نا۔" اس نے مجھے گدگدانا چاہا۔ میں اس کے بڑے بڑے ہاتھ دیکھ کر لرز گئی۔

ہٹو صلو...... خدا کے لئے۔ تم سے ڈر لگتا ہے ریچھ ہو گئے ہو بالکل۔"

"ہاں۔" اور وہ غرور سے اور پھیل گیا۔

"ارے میں ماروں گی صلو......" اس نے زبردستی اپنا کھردرا گال میرے ہاتھ پر زور سے رگڑ دیا۔ سارا ہاتھ جھلا اٹھا۔ جیسے لوہے کا برش۔ کبھی تو میں آ کر پچھتاتی تھی نہ جانے کیوں۔

شادی کا گھر اور وہ بھی ہندوستانی طریق۔ گھر کیا ہوتا ہے ایک بھول بھلیاں کا راستہ جس میں مزے سے آنکھ مچولی کھیلو۔ سر کو پیر کی خبر نہیں رہتی اور نہ جانے کتنے کھلاڑی آنکھ مچولیاں کھیل رہے ہوتے ہیں۔ کبھی دو چوروں کی کسی کونے میں ٹکر ہو جاتی ہے تو پھر جھینپ! مزہ آجاتا ہے۔

معلوم ہوتا تھا کہ گھر کے ہر کونے، ہر دیوار کی آڑ میں، ہر زینہ پر کئی کئی صلاح الدین کھڑے ہیں۔ آپ کدھر بھی چلی جائیے ناممکن جو صلاح الدین نہ موجود ہو جائے بعض وقت تو یہ معلوم ہوتا گویا آسمان ہی سے ٹپک پڑے۔ میں عاجز آکر رابعہ کے پاس گھس گئی۔ لو وہ تھوڑی دیر میں لاڈلا بھیا بہن کی صورت دیکھنے کو موجود! اور پھر یہ کہ ہم دونوں رضائی میں بمشکل سما رہے ہیں کہ جناب اپنے بے ڈول ہاتھوں اور چوڑے کندھوں کے اسی رضائی میں گھسیں گے۔ کس سے شکایت کی جائے۔ کس کے آگے گلا کریں یعنی ان جگر کے ٹکڑے کلیجے کی۔ کس سے شکایت کی جائے؟ اور کیا شکایت ہو۔ گھڑک دو سنجیدگی سے ڈانٹ دو آپ ہی شرم آئے گی۔ مگر وہ سنجیدہ ہونے کا موقع بھی دے۔

"جاؤ صلو سر میں درد ہے۔" جو یہ بہانہ کیا تو۔

"سر میں درد؟ ارے اماں جان بام کہاں ہے ڈرائیور کو بھیجئے، ڈاکٹر سے اسپرو لائے اور بھئی کوئی شور کرے گا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔ چلو رشو، حمید، منی کھسکو یہاں سے بجو کے سر میں درد ہے، دروازہ بند یا اللہ لیجئے سر کا درد غائب اور اماں جان سے ضروری کام نکل آیا۔

"کیوں بجو جھوٹی! کہہ رہی تھی سر میں درد ہے اور یہاں پوریاں تلی جا رہی ہیں۔" لیجئے باورچی خانہ میں بھی موجود۔ اب بھاگئے۔

کبھی آنچ بگاڑ دی کبھی کچھ اور، پھر وہی شرارتیں! باورچی جانتا ہے کہ میاں بے چین بوئی ہیں۔

"بی بی آپ بھی جائیے اور صلو میاں بھی۔ ورنہ مجھ سے کھانا پک چکا۔"

"صلو مجھے تم سے ایک بڑی ضروری بات کہنی ہے۔" میں نے سوچا آج انہیں سنجیدگی سے ڈانٹوں۔

"کس سے؟ مجھ سے؟...... ارے میرے بھاگ!" ایسے خوش گویا تمغہ ملنے والا ہے۔

اب ضروری بات کہنے سے پہلے خود اس قدر ضروری خدمات انجام دینا شروع کیں کہ بھاگتے ہی بن پڑے۔

کیا لوگ اندھے ہوتے ہیں؟ دکھائی نہیں دیتا انہیں؟ آنکھ مچولی میں تو بڑے بڑے شاہ پکڑے جاتے ہیں اور صلو جیسا چور! دن دھاڑے ڈاکہ ڈالنے سے نہ چوکے۔ لوگ سمجھتے ہیں بچہ ہے۔

سنیما میں لوگوں کو بس عورت ہی عورت دکھائی دیتی ہے۔ خواہ ہزاروں مرد کام کر رہے ہوں اور میں بھی عورت تھی مجھے جلد معلوم ہو گیا کہ چند ایسے غیر جانبدار بھی ہیں جو فیصلہ کرتے وقت نہ کسی کے کلیجہ کا ٹکڑا دیکھیں نہ جگر کی ٹھنڈک' کھٹی دھار پڑتی ہے تلوار کی مجھے تو الزام دے گی دنیا! یہ تو کوئی دیکھتا نہیں کہ فتنہ...... غصہ سے آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔

"ہٹ جاؤ صلاح الدین۔ حد ہوتی ہے بے ہودگی کی۔ مجھے یہ باتیں پسند نہیں۔"

"ایں۔" اس کا منہ اتر گیا۔ "کیا ہوا بجو؟"

"کچھ نہیں...... تمہیں معلوم ہے لوگ کیا کہتے ہیں۔"

"میرا بولنا...... میرا...... آپ کو برا لگتا ہے۔"

"ہاں مجھے بہت برا لگتا ہے۔ اچھی بات نہیں۔ لوگ......"

"لوگ؟ کون لوگ؟ کون لوگ ہیں وہ مجھے بھی بتاؤ ذرا------"

"کوئی بھی ہوں وہ میری اور تمہاری بہتری چاہنے والے۔"

"بہتری۔" وہ سرخ ہو گیا۔

"ہاں اسی میں بہتری ہے-----" اور میں تیزی سے چلی آئی- دل پر سے
ایک بوجھ اتر گیا- آخر کو میں نے کہہ ہی دیا----- عورت کے تو ہاتھ میں ہے
خواہ وہ بدراہ ہو جائے خواہ عین موقعہ پر آنکھیں کھل جائیں اور اسے عاقبت نظر
آنے لگے----- آنکھیں کھل گئیں----- اور خوب موقعہ پر کھلیں میں دل ہی
دل میں مسکرا رہی تھی-

صلاح الدین آیا----- میں حسب عادت چوکنی ہو گئی----- مگر گزرا چلا
گیا اس نے مجھے دیکھا تک نہیں----- میرے دل پر گھونسہ سا لگا-----
خیر...... اونہہ کیا ہے...... بہتری اسی میں ہے بلا سے جان چھوٹی- کسی وقت سکون
ہی نہ تھا- اب تو...... خیر اور گھر کے ہر کونے اور ہر موڑ اب کوئی بھی نہ تھا- گویا
امن چین اور سکون! لیکن پھر یہ پریشانی کیسی؟ ایک فکر کی ایک پستی گویا کمان اتر
گئی- دھار کھٹل ہو گئی گویا کچھ ہے ہی نہیں- اب کوئی آپ کو دیکھ کر کھنچا چلا
نہیں آتا- اب کسی کو شرارتیں نہیں سوجھتیں- اب کسی کی عجیب اور پاگل
آنکھیں آپ کے پیچھے نہیں دوڑتیں- جائیے شوق سے جائیے اندھیر کوٹھری میں بھی
چلے جائیے کوئی مزاحمت نہیں کرتا- چور ملتا بھی ہے تو آپ کو جھک کر آداب کرتا
ہے اور سر جھکا کر چل دیتا ہے ایک طرف کو--- اب کوئی آپ کے پاس گھس کر
بیٹھنے کا شوقین نہیں بلکہ دور...... وہ سامنے کمسن خوبصورت لڑکیوں کے جھرمٹ
میں شرارت بھری آنکھیں نچا کر خراج تحسین وصول کر رہا ہے کبھی بھولے سے
بھی اگر آنکھ مل جاتی ہے تو سر جھک جاتا ہے پہچانتا تک نہیں-----!

شادی کے گھر میں معلوم ہوتا ہے موت ہو گئی ایک موت نہیں سینکڑوں
موتیں، ہزاروں خیالات، سینکڑوں جذبات اور ان گنت مسکراہٹیں مردہ پڑی ہیں گھر
بھائیں بھائیں کر رہا ہے-

اور چچی تو معلوم ہوتا ہے کبھی تھیں ہی نہیں کوئی اپنی----- رابعہ اپنے
دولہا کے خیال میں مست- حمیدہ کا بچہ ضروریات زندگی سے فارغ نہیں ہو چکتا جی
چاہا بیچ شادی سے چل دوں کالج-

دیکھنے والوں نے دیکھ بھی لیا اور تاڑ بھی لیا۔

"اے یہ صلو کی اور تمہاری کیا ان بن ہو گئی ہے------" چچی بولیں۔

"نہیں تو------" میں جلدی سے بولی۔

"جھوٹ------" صلو نے دبی آواز میں کہا اور کھانے کی پلیٹ پر جھک گیا۔

"اوئی------ چھوٹوں سے کیا غصہ------ چلو صلو باجی سے معافی مانگو------"

"جی نہیں...... یہ خود معافی مانگیں------ صلو اکڑے۔

"معافی وافی کیسی، کوئی لڑائی نہیں ہوئی------" میں نے معاملہ کو سیدھا کرنا چاہا------

"جی نہیں میری تو ہے لڑائی۔"

"یہ کیوں------ آخر ہوا کیا------؟"

"ہوا یہ کہ...... خواہ مخواہ ڈانٹنے لگیں......"

"کچھ بھی نہیں چچی جان۔ یہ مجھے چھیڑ رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا مجھ سے مت بولو------ بھلا میں اس سے لڑوں گی------" میں جلدی سے بولی۔

"نہیں اماں جان...... کیسی بھولی بن رہی ہیں، ایسے انہوں نے نہیں کہا تھا------"

اور میں ڈری کہ کہیں اس نے کہہ دیا سب کے سامنے تو کیا ہو گا۔ مجھے خیال ہوا کہ میری غلط فہمی ہو گی شائد یہ بھی اس کی شرارتیں ہیں اور...... اور شائد یہ شرارتیں ہی ہوں------" لعنت ہے کہ میں اسے اس قدر ذلیل سمجھی!

"مجھے ایسی بری طرح کہنے لگیں...... ہونہہ جیسے میں کوئی وہ ہوں۔"

"ارے میں تو یوں ہی کہہ رہی تھی لیجئے ملاپ ہو گیا اب------؟"

"لو------ اسی بات پر ہاتھ ملاؤ اوہ...... کس قدر سردی ہے ساری رضائی آپ اوڑھے بیٹھی ہو یہ نہیں کہ کسی اور کو بھی اڑھا لو------"

وہ رضائی میں گھس کر بیٹھ گیا اور مجھے اتنی چٹکیاں لیں کہ ملاپ کرنے کا مزہ آگیا۔

''صلو خدا کا واسطہ پھر کہو گے میں نے یہ کہا اور وہ کہا-----'' چچی جان معصومیت سے مسکرا رہی تھیں-----

''کہا ہی کیسے تم نے-----بولو ہاریں کہ نہیں-----''

''بابا میں تجھ سے جیتی اور نہ جیتنے کا شوق-----بس-----'' وہ ہنسا۔ دنیا کی ہر چیز ہنس پڑی۔

اور پھر وہی آنکھ مچولی! وہی بھول بھلیاں! اور عاقبت ایک دفعہ کو عاقبت بھی کھلکھلا پڑی۔ کونا کونا مسحور کن نغموں سے گونج اٹھا۔ کان گنگ ہو گئے اور آنکھوں میں ریت بھر گئی۔ میٹھی میٹھی کھٹک والی ریت

اور اب قصور کس کا؟--- قصور تو ہونا ہی ہوا کسی کا----- تقدیر کا بچاری تقدیر----- بات یہ ہے کہ اللہ پاک اپنے بندوں کی آزمائش کرتا ہے یہ دیکھنے کے لئے کہ...... وہ ناکہ دیکھے----- یہی کہ بس دیکھے----- جیسے کہ ہم تماشہ دیکھتے ہیں----- ڈر' دھڑکا' بدنامی' ذلت' پریشانی' بربادی تباہی اور سب کچھ ایسے ہی موقعہ کی تاک میں رہتے ہیں----- کچی شاخ میں جھولا ڈالو تو آپ ہی چرچرائے گی----- بھئی خوب ٹھونک بجا کر دیکھ لینا چاہئے کہ گدا کمزور تو نہیں----- رسی تو گھنی گھنائی نہیں----- ورنہ آپ ہی پٹخنی لگے گی۔

لڑائی پر جانے سے چند دن پہلے تشریف لائے ننھا برآمدے میں ''لفٹ رائٹ لفٹ رائٹ'' کر رہا تھا اسے دیکھ کر ایسے سٹپٹائے کہ بس......

''لمبی چوڑی ہے میری فوج-----'' میں نے سوچا بڑے بڑے دل دہل جاتے ہیں اسے دیکھ کر-----''

''تم نے مجھے بتایا بھی نہیں-----''

''کیا......''

''یہ...... یہ...... وہ ننھے کو گھورنے لگے۔

"اوہ یہ...... ہاں کوئی ایسی بتانے کی بات ہی کیا تھی- میں نے اسے یتیم خانہ سے لے لیا تھا----- جی بہلتا ہے اس سے-----"

"مگر یہ...... سچ بتاؤ-----"

کتنی گھبراہٹ اور کتنی التجا تھی-

"کیا بتاؤں-----؟ ہاں تم اپنی کہو یہ چچی جان نے لاڈلے بیٹے کو کیسے لڑائی پر بھیج دیا-----"

میں نے بات پلٹی-

"لڑائی پر......وہ ...... ہو گا...... تم پہلے یہ بتاؤ...... کہ ......" وہ ننھے کی طرف مڑے-

"سمجھ ہی میں نہیں آتا تمہاری تو----- کیا تو یتیم خانہ......"

"ہوں......" صلو کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا کچھ کھوئی ہوئی سی کھسیانی صورت......"

"جی گھبرا رہا ہے-" میں نے چھیڑا-

اور ان کی رنگت بدلی----- بچارا بچہ! مر گیا----- اس کا باپ شائد تلخی سے کہا-

"خاک تمہارے منہ میں- خدا نہ کرے-----" میں نے ننھے کو کلیجے سے لگا لیا-

"ٹھائیں......" ننھے نے موقعہ پا کر بندوق چلائی-

"ہائیں...... باجی...... ابا کو مارتا ہے-----" میں نے بندوق چھین لی اور پھر آنکھوں میں وہی شرارت تڑپی...... پھر...... بلا کی گہری ہو گئیں----- کچھ پاگل...... عجیب سی...... ٹٹولنے کے باوجود اس بھول بھلیاں میں راستہ نہ ملا-

❀❀❀

بلا خیزی

کرشن چندر

میں جب عصمت چغتائی کے افسانوں کا تجزیہ کرنے بیٹھتا ہوں تو ایک عجیب دشواری پیش آتی ہے۔ ان کے افسانے عالم شاہراہ سے ہٹ کر ایک اور ہی نہج اختیار کر چکے ہیں۔ ان کی حیثیت اس قدر مختلف اور منفرد نظر آتی ہے کہ ان پر عام ادبی اقدار کا اطلاق کرتے ہوئے کچھ دقت سی محسوس ہوتی ہے۔ عصمت کے افسانے گویا عورت کے دل کی طرح پر پیچ اور دشوار گزار نظر آتے ہیں۔ میں شاعری نہیں کر رہا اور اگر اس بات میں کوئی شاعری ہے تو اسی حد تک جہاں تک شاعری کو سچی بات میں دخل ہوتا ہے۔ مجھے یہ افسانے اس جوہر سے متشابہ معلوم ہوتے ہیں جو عورت میں ہے' اس کی روح میں ہے' اس کے دل میں ہے اس کے ظاہر میں ہے اس کے باطن میں ہے۔ یہ افسانے شاید "تل" کی ہیروئن "رانی" کے جسم کی طرح ہیں۔ اور جب کبھی اس جوہر کو پرکھنے سے عام ادبی اقدار میں ڈھالنے اور کلیوں میں پھانسنے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ جوہر ایک ایک نظر نہ آنے والے غیر مرئی ہیولی کی طرح قابو میں نہیں آتا۔ اور "تل" کے ہیرو "چودھری" کے الفاظ میں:۔

"سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ ہزاروں رنگ لتھیڑنے پر بھی وہ اس کے جسم جیسا مصالحہ تیار نہ کر سکا اس نے سیاہی صندلی گھول کر اس میں ذرا سا نیلا رنگ ملا دیا۔ پھر بھی اس کے رنگ کی چمک آبنوسی صندلی' نیلی اور کچھ بادامی لہر لئے ہوئے تھی۔ ایک مصیبت ہوتی تو خیر تھی' آج اس کا رنگ سرمئی ہوتا تو دوسرے دن اس میں شفق کی سی سرخی پھوٹنے لگتی۔ اور پھر کبھی بالکل اچانک اس کا جسم ختم

ہوتی ہوئی رات کی طرح کچھ اودی اودی گھٹاؤں سے ملنے لگتا اور کبھی نہ جانے کہاں سے اس میں سانپ کے زہر کی سی پیلاہٹ جھلکنے لگتی اور آنکھیں بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتیں۔ اس نے پہلے دن نہایت اطمینان سے کولتاری سا سیاہ رنگ گھول کر تیار کیا لیکن پھر اسے پتلی کے گرد لال لال ڈورے نظر آئے۔ خیر وہ بھی ہوئی۔ پھر ان ڈوروں کے آس پاس کی زمین بادلوں کی طرح نیلی معلوم ہونے لگی۔ وہ جھنجلا گیا اور ڈھیر سارنگ بیکار گیا۔ لیکن اس کے غصہ کی جب تو انتہا ہی نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ ذرا سی دیر میں وہ سیاہ کولتار جیسی پتلیاں سبز ہونے لگیں اور ہوتے ہوتے وہ زمرد کی ڈلیوں کی طرح ناچنے لگیں۔ پتلیوں کے آس پاس کا میدان دودھیلا سفید ہو گیا اور ڈورے قرمزی ہو گئے۔"

جب تو
تب تو

یہی گوناگوں بوقلموں رنگارنگی، ان کی متلون مزاجی پر پیچ تواتر اور سحر انگیز مشتعلگی جسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن اتنی شدت سے بیان نہیں کیا جا سکتا، ان افسانوں کا جوہر عظیم ہے۔

پہلے پہل جب میں نے عصمت چغتائی کے افسانے پڑھے تو مجھے یوں معلوم ہوا گویا میرے ذہن کی چار دیواری میں ایک نیا دریچہ کھل گیا ہے۔ یہ دریچہ جو میرے ذہن، شعور اور ادراک کی دنیا میں ایک نئے منظر کا اضافہ کرتا ہے میں نے اس منظر کی جزئیات کو گاہے گاہے دیکھا تھا اس کے کرداروں کا بھی فروعی مطالعہ کیا تھا۔ ان کی خوشیوں اور غموں کو ایک اڑتی اچٹتی ہوئی نظر سے دیکھا بھی تھا۔ لیکن کبھی اس سارے منظر کو۔ اس کی عام جزئیات کو، ان تمام کرداروں کو ان تمام خوشیوں اور غموں کے ساتھ اس قدر تناسب اور مکمل نہ پایا تھا جو چیز کبھی قاشوں میں، ٹکڑوں میں چھوٹی چھوٹی جھلکیوں میں دیکھی تھی وہ آج ایک مکمل تصویر کی صورت میں نظر آئی۔ یہ تصویر خوبصورت بھی تھی، بدصورت بھی، اس میں آنسو بھی تھے اور قہقہے بھی۔ زندگی کی گہرائی بھی اور اس کا چھچھورا پن بھی۔ نفرت اور مٹ جانے کے آثار بھی، جو کسی عورت ہی کو نصیب ہو سکتی ہے۔ اور پھر میرے چچیرے، خلیرے بھائی بہن، ان کی چاہتیں، ان کی رسوائیاں، لگاوٹیں، حلاوتیں۔

اس تصویر میں ایک مسلم گھرانے' ایک متوسط طبقے کے شہری مسلم گھرانے کی روح کھنچ آئی ہے۔ اس قدر صاف واضح کہ نقش اولین ہی نقش آخر معلوم ہوتا ہے۔ نئے افسانہ نگاروں میں دو ایک اور نے بھی اس تصویر کو پیش کیا ہے اور حق تو یہ ہے کہ نہایت عمدہ طریق سے پیش کیا ہے اور عصمت چغتائی سے پہلے پیش کیا ہے لیکن انہوں نے اسے ایک مرد کے زاویہ نگاہ سے جانچا ہے اس لئے چند جزئیات غیر متناسب ہیں۔ چند خطوط غیر متوازی ہیں کیونکہ مرد اکثر گھر کی چار دیواری سے باہر رہتا ہے اور متوسط طبقے کے شہری مسلم گھرانے کی بہو بیٹی اکثر گھر کی چار دیواری ہی میں زندگی بسر کرتی ہے۔ یہ گھر اس کی روح کا ملجا و ماوی ہے۔ اس کی روحانی' جسمانی زندگی کا مرکز ہے۔ اسی لئے تو عصمت کے افسانوں میں اس گھرانے کا حال اس قدر شدت تاثر کے ساتھ مرقوم ہے کہ پڑھنے والے کو افسانہ کے ماحول اور اس کے کرداروں سے ایک روحانی قرابت کا احساس ہوتا ہے اور وہ ان کے دکھوں' تکلیفوں اور مسرتوں کو انہیں خوشیوں اور صعوبتوں سے اس قدر ہم آہنگ کر لیتی ہے کہ کوئی حد فاضل نہیں رہتی۔ یہاں کرداروں کا ماحول اور ان کی زندگی اس کی زندگی سے مملو معلوم ہوتے ہیں۔ اور وہ متوسط طبقہ کا مسلم گھرانا' اس کا اپنا گھر۔ اس لحاظ سے عصمت چغتائی کے افسانے بہت کامیاب ہیں۔

زبان

ان افسانوں کے مطالعہ سے ایک اور بات جو ذہن میں آتی ہے وہ ہے گھوڑ دوڑ۔ یعنی رفتار حرکت' سبک خرامی اور تیز گامی۔ نہ صرف افسانہ دوڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے' بلکہ فقرے کنائے اور اشارے اور آوازیں اور کردار اور جذبات اور احساسات ایک طوفان کی سی بلاخیزی کے ساتھ چلتے اور آگے بڑھتے نظر آتے ہیں۔ اور کبھی کبھی پڑھنے والے کا ذہن اس قدر پیچھے رہ جاتا ہے کہ دل ہی دل میں وہ افسانہ نگار کو کوستا رہ جاتا ہے یعنی عورت ہو کر بھی اس قدر بھاگم دوڑ کیوں ہمیں یہ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ سچ ہے یہ احساس شکست اور وہ بھی عورت کے ہاتھوں کسے اچھا لگتا ہے۔ لیکن یہ بلاخیزی تندرست و توانا انسان کے لئے صدائے جرس سے کم نہیں۔ اٹھو' کام کرو' جاگو' بھاگو' ہندوستان کی عورت اپنی روح میں بیداری

اور بیداری کے ساتھ نسیم صبح کی تازگی اور توانائی محسوس کر رہی ہے۔ وہ عہد کہن کی تمام کلفتوں کو مٹا کر ایک نئی حرکتی زندگی کا آغاز کرنا چاہتی ہے۔ ان افسانوں کے ذہنی تسلسل کی تیز رفتاری اس نئی زندگی کے خارجی پہلو کی آئینہ دار ہے۔ "بیمار" میں:۔

"اور پھر دندنا کر بڑا ۔۔۔ اور کنکٹی بندھ جاتی۔ معلوم ہوتا ہڈیاں چیخ رہی ہیں۔ اور کھال جھلنے لگتی۔ گلے میں جیسے رہٹ چلنے لگتا۔ چوں چر۔ شرڑ، کھڑ اور پھر کھانسی کے پھندے پڑنے لگتے۔"

بچے آنگن میں کلکاریاں مارتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ گویا اس کے کلیجے پر گھن برس رہے ہیں۔ بس وہ ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے دروازہ سے دھڑ دھڑاتے نکل جاتے اور اس کی زندہ لاش سر سے پیر تک لرز جاتی اور پھر دوسری آوازیں بھیانک بھونپو والی لاریاں، کوکتی ہوئی موٹریں، کھڑکھڑاتے تانگے اور منمناتی ہوئی سائیکلیں، سب گویا اس کے سینے پر سے دندناتی گزرتیں۔ "رام رام ست ہے۔" اس کا کلیجہ مسل جاتا۔"

"ٹنن ٹنن کوئی کالج کی لڑکی سائیکل اڑاتی آ رہی تھی۔ خواب پھر بدلے۔ کیا عجب سائیکلیں ٹکرائیں جیسے ستارے ٹکراتے ہیں۔ اور پھر طوفان..... گرج اور چمک، بے ہوش حسینہ..... مگر..... وہ بریک..... بریک لگا ہی نہیں۔ ایک ستارا کاوا دے کر نکل گیا۔ ایک گرا دھم سے گھٹنوں سے پاجامہ مسک گیا گٹے چھل گئے۔ دوسرے ستارے کی ساری دور موٹر پر ہوا میں لہرائی اور گم۔"

(اس کے خواب)

میرے خیال میں کوئی حادثہ بھی اس برق رفتاری سے وقوع میں نہیں آتا کہ جس طرح عصمت چغتائی نے اسے بیان کیا۔ سرعت، حرکت، رفتار مختصر افسانے کا ایک اہم جزو ہے اور اس لحاظ سے مجھے اپنے کئی افسانے ٹھس معلوم ہوتے ہیں۔ ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح رکے ہوئے۔

"کاش اس کا بس چلتا تو وہ بتاتا منحوس لڑکی۔ بڑی علم حاصل کر رہی ہیں کچھ

نہیں۔ کچھ پڑھنے وڑھنے کی ضرورت نہیں جنگلی...... ان سے سادھو کی لڑکی ہی ہزار بلکہ کروڑ درجہ اچھی تھی۔ دودھ تازہ چمکتی ہوئی پیتل کی لٹیا میں باچھوں میں بہہ رہا ہے اس سے تو وہ سڑک کوٹنے والی ہی اچھی گو اس کی کھال جھلس کر سائیکل کی گدی سے ملنے لگی ہے اور پنڈلیاں پھوڑوں سے لدی ہوئی ہیں اور دو منٹ پاس بیٹھ جاؤ تو جوئیں بلبلانے لگیں۔ مگر ذرا آنکھ جھپکاؤ مسکراہٹ کی بجلیاں تیار۔"

(اس کے خواب)

"ایک الماری کے بالائی تختہ پر ایک گھڑی رکھی ہے۔ چوڑی سی، موٹی عورت کے چہرہ کی مانند کڑک مرغی کی طرح کٹاک کٹاک کرتی رہتی ہے۔ یہ گھڑی اس گھر میں بالکل مالکہ مکان کی حیثیت رکھتی ہے۔ جونہی دس بجتے ہیں۔ گائے سینگ بدلتی ہے، نظام فلکی میں تبدیلی ہوتی ہے۔ کرسی کا پتلون ایک سپاٹے سے غائب ہو جاتا ہے۔ پائے پر رکھی ہوئی پسینہ دار بھوری ایڑی بھد سے زمین پر آ رہتی ہے۔ کپڑوں کی جھنک* پھنک سنائی دیتی ہے۔ گویا فرشتے پھڑپھڑا رہے ہوں۔ پھر زمین پر جوتیاں رینگنی شروع ہوتی ہیں معلوم ہوتا ہے پوری باٹا کمپنی کے جوتے پڑے مچل رہے ہیں۔ جوتوں کی گھس* گھس سے آپ کے دانت کسکسا* اٹھتے ہیں۔ جیسے ان کے درمیان کوئی ریت کی چٹکیاں چھڑک رہا ہو۔"

(جھری میں سے)

اور یہ راحت کی شان ہے:۔

"راحت! آپ نے چند موم کی پتلیوں کو تو دیکھا ہو گا۔ ننھی منی کھیل کود کی شوقین جن کا مقصد زندگی کھیلنا ہے۔ گڑیوں سے کھیلنا، کتابوں سے کھیلنا۔ اماں ابا سے کھیلنا اور پھر عاشقوں کی پوری پوری ٹیم سے کبڈی کھیلنا۔ ابھی میرے بد نصیب بھائی کے ساتھ ہنس کھیل کر آ رہی تھی۔"

(جنازے)

"مکھیوں کی پھلوں سے دکھی ہو کر آخر بڑھیا بھڑ*بھڑا ہی اٹھی۔ یہ مکھی ذات جی کے ساتھ لگی تھی۔ پیدا ہوتے ہی گٹھی کی چپچپاہٹ* سونگھ کر جو مکھیاں منہ پر

بیٹھنا شروع ہوئیں تو کیا سوتے کیا جاگتے بس آنکھ ناک اور ہونٹوں کی طرح یہ بھی جسم کا ایک عضو بن کر ساتھ ہی رہتی تھیں۔ اور ایک مکھی تو نہ جانے سالہا سال سے اس کی دشمن ہو گئی تھی۔ جب لکھنؤ میں تھی جب، پھر جب اناؤ گئی تو برسات میں پھر کاٹا اور لوسندیلہ میں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اگر بڑھیا کو معلوم ہوا کہ اسے اس کے جسم کے کون سے مخصوص حصہ سے انس ہے تو وہ ضرور وہ حصہ کاٹ کر مکھی کو دے دیتی۔ مگر وہ تو ہر حصہ پر ٹہلتی تھی۔ وہ کبھی کبھی غور سے اس خاص کٹ کھنی مکھی کو دیکھتی۔ وہی جتلے پر، ٹیڑھی ٹانگیں اور مٹکا سا سر۔ وہ بڑے تاک کر پنکھے کا چھپاکا مارتی۔ مکھی تنن تنن کر کے وہ گئی۔"

(ساس)

ان ٹکڑوں کو بلند آواز سے پڑھیے اور پھر ان کی صوتی رفتار کا بھی اندازہ لگائیے۔

لیکن افسانہ میں اگر رفتار ہی رفتار ہو، سمت نہ ہو، نہج متعین نہ ہو تو افسانہ ایک وحشی ہرنی کی چوکڑی بن کر رہ جاتا ہے۔ "کیوں رے کتے" کی پڑوسن برجوں کی طرح جو الھڑ اور لاابالی ہے اور جو زندگی کے دھارے پر آپ ہی آپ بہے جا رہی ہے اور جسے نہ اس کی رفتار کا اندازہ ہے نہ سمت کا۔

"پلنگ کی ادوانوں اور بانوں کے چھینکوں کا ذکر اوھ سنا ہی چھوڑ کر وہ برآمدہ میں آگئی باہر پڑوسن کے دو بچے کھڈیوں پر بیٹھے کسی نہایت دلچسپ مسئلہ پر لڑ رہے تھے۔ دور ایک گائے کھڑی کوڑا کھا رہی تھی۔ برجو الجھ کر برآمدے میں رکھے ہوئے گملوں کو دیکھنے لگی۔ وہ ایک خوش رنگ پھول توڑ کر اس نے اپنی لمبی چوٹی کے بالائی سرے سے اڑس لئے اور نیچے کیاریوں میں سے دھینے کی ننھی ننھی پتیاں توڑ کر سونگھنے لگی۔ بڑے کھڑاپے میں آکر اس نے منڈیر پر اگی ہوئی بے کار گھاس کو نوچ کر الگ کر دیا۔"

(کیوں رے کتے)

یہاں برجو کے داخلی اور خارجی افعال کی کوئی سمت نہیں۔ وہ یونہی اکتائی ہوئی

سی گھوم رہی ہے اور اگر اس طرح افسانہ بھی کسی سمت کے بغیر گھومنے لگے تو افسانہ کے سب اجزائے ترکیبی پریشان ہوجاتے ہیں اور نتیجہ ایک اچھے افسانے کی صورت میں نہیں بلکہ ایک ذہنی انتشار کی صورت میں نمودار ہوتا ہے بظاہر جب عصمت چغتائی کا کوئی افسانہ شروع کیا جائے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کمبخت افسانہ کی کوئی سمت نہیں اس کے محور کا کوئی پایہ سیدھا نہیں۔ "لیکن جوں جوں افسانہ پڑھتے جایئے اس چوکڑیاں بھرتی ہوئی وحشی ہرنی کی سمت واضح ہوتی جاتی ہے۔ وہ عام افسانوی رہگذر سے ہٹ کر ایک نئے جنگل میں جارہی ہے ایک نئے مرغزار میں، نئے اشجار، نئے طیور، نئے افق کہ آدمی یکایک ٹھنک کر رہ جاتا ہے کبھی کبھی تو افسانہ کے قریب اختتام ہونے تک اس کی سمت کا پتہ نہیں چلتا۔ پھر یکایک سارا افسانہ اس تیزی سے گھوم کر حرف مطلب پر واپس آتا ہے کہ یکایک پڑھنے والے کی حیرت مسرت میں مبدل ہوجاتی ہے۔ ساری جزئیات صحیح روشن، متناسب اور برمحل معلوم ہوتی ہیں۔ جذبات کردار سے، کردار ماحول سے ہم آہنگ معلوم ہوتے ہیں۔ اس قسم کی فنی صناعی کی بہترین مثال "بھول بھلیاں" ہے بھول بھلیاں کے اس جنگل میں پڑھنے والا فکری اعتبار سے بار بار بھٹکتا ہے۔ اس کے درختوں اور جھاڑیوں سے بار بار الجھتا ہے چیختا ہے۔ چلاتا ہے، کوسنے دیتا ہے۔ نہ صرف فکری اعتبار سے بلکہ خارجی نقطہ نگاہ سے بھی عصمت چغتائی نے اس افسانہ کی انشاء میں اس کے فقروں کی نشست و برخاست میں اس کے مختلف نثری ٹکڑوں کی تدریجی ارتقا میں اس صناعی کو ملحوظ رکھا ہے اور سب سے آخری افسانے کے آخری چند فقروں میں جب مطلب ایک بجلی کی لپک کی طرح کوندتا ہے افسانہ کی نہج مکمل طور پر روشن ہوجاتی ہے۔ سمت کو چھپانے میں پڑھنے والے کو حیرت و اضطراب میں گم کردیتے ہیں اور پھر یکایک آخر میں اس اضطراب اور حیرت کو مسرت میں مبدل کردینے کی صنعت میں عصمت اور منٹو ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ اس فن میں اردو کے بہت کم افسانہ نگار ان کے حریف ہیں۔

پھر یہ سمت کیا ہے؟ کیا یہ سمت معکوس تو نہیں۔ کیا یہ آگے بڑھنے کے

"ماضی کی طرف لوٹو" کی پیغامی علامت تو نہیں۔ کیا عصمت اور دوسرے کئی ایک افسانہ نگاروں کی طرح رومان کے مرمریں قصر میں محبوس ہو جانا پسند کرتی ہیں۔ جہاں ماضی کی ہر چیز اجلی نکھری اور سونے کی طرح خوبصورت اور شفق کی طرح گلگوں نظر آتی ہے لیکن عصمت چغتائی کے یہاں عہد کہن کی دھندلی میٹھی یاد نہیں جو قدامت پرستوں کی آنکھوں کو ڈبڈبا دیتی ہے وہ ایک سسکی لے کر نمناک آواز میں کہہ اٹھتے ہیں۔ آہ! وہ کیا زمانہ تھا وہ کافوری شمعیں۔ وہ چلمن کی اوٹ، وہ مینا کے نازک، وہ ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی یا رومان پرستوں کی وہ تخیل آفرینیاں جن پر بقول مولانا صلاح الدین "حقیقت خندہ زنی کرے اور مشاہدہ اپنا سر پیٹے۔" عصمت چغتائی کے ہاں اس قسم کی پیغامیت اور جذباتیت نہیں وہ پرانی قبروں کی پرستش نہیں کرتیں بلکہ حقیقت کو اپنے تخیل کی شفاف آگ میں پگھلا کر اپنی زبان کے تیز و تند اور تلخ تیزاب میں اتار کر ایسے جاندار مرقعے تیار کرتی ہیں کہ جہاں پڑھنے والا افسانہ نگار کی چابکدستی اور فنکاری کی داد دیتا ہے۔ وہاں اپنی اور اپنے سماج کی شکل پر بسورتا رہ جاتا ہے۔ اس لئے مجھے بیحد خوشی ہوئی ہے جب لوگ عصمت چغتائی کو گالیاں دیتے ہیں کیونکہ وہ لوگ دراصل اس وقت اپنے آپ کو گالیاں دے رہے ہوتے ہیں اپنی اس مکروہ عفونت کو جسے وہ روحانیت کی خوشبوئیں لگا کر چھپانا چاہتے ہیں۔ اس جنسی بھوک کو جسے عصمت نے جگہ جگہ اپنے افسانوں میں عریاں کیا ہے اور جسے یہ سماج ایک جھوٹی شرافت اور مذہبیت کی تہوں کے نیچے چھپا کر رکھنا چاہتا ہے۔ عصمت نے جگہ جگہ سماج کی اس مکاری اور ابلہ فریبی کو بے نقاب کیا ہے اور ایک ایسی بے پناہ طنزیہ انداز نگارش سے کام لیا ہے جو برے کی طرح چھیدتی چلی جاتی ہے۔ "دوزخی" میں خود عصمت نے اس طرز نگارش کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔

"دنیا بدل گئی ہے۔ خیالات بدل گئے ہیں۔ ہم لوگ بد زبان ہیں اور منہ پھٹ۔ ہم دل دکھتا ہے تو رو دیتے ہیں۔ سرمایہ داری۔ سوشلزم اور بیکاری نے ہم لوگوں کو جھلس دیا ہے ہم جو کچھ لکھتے ہیں دانت پیس پیس کر لکھتے ہیں۔ اپنے پوشیدہ

"دوزخی"

دکھوں، کچلے ہوئے جذبات کو زہر بنا کر اگلتے ہیں۔" (دوزخی)

"جی ہاں پنکچر ہو گیا شاید۔" میں نے معصومیت سے کہا۔

"واقعی" وہ بے ہنگم سا لمبا انسان مذاق اڑانے کے لہجہ میں بولا۔

"جی ہاں، کوئی کانٹا چبھ گیا شاید!" میں نے معصومیت کی دال نہ گلتے دیکھ کر اونچی اور کھتری آواز میں کہا۔

"واقعی!" پھر وہی کمینہ، تمسخرانہ گفتگو۔ کاش، کوئی اسے خواتین سے گفتگو کرنے کا سلیقہ سکھاتا۔ (کاش کبھی ہندوستانی نوجوان خواتین سے اس غیر رومانی انداز میں گفتگو کر سکتے)

"اس سے آپ کا مطلب؟"

"یہی کہ شوق----- آپ لوگوں کو ذرا شوق ہوتا ہے کہ جہاں کوئی رومنٹک جگہ دیکھ لی اور کوئی حادثہ لے بیٹھیں پنکچر ہو رہے ہیں۔ دریا میں ڈوبی جا رہی ہیں۔ بدمعاش لئے جاتے ہیں، جہاں دیکھو۔"

اور ایک کنوارے اسکول ماسٹر کے جنسی خواب جن میں شاید سینکڑوں افسانوں کے آغاز اور انجام کروٹیں لے رہے ہیں۔

"خواہ وہ جنگل کتنا ہی حسین اور سریلا کیوں نہ ہو یہ لازمی ہے کہ وہاں ایک حسین لڑکی ہو۔ بے حد حسین بھلا سادھو کی لڑکی جنگل میں دریا کے کنارے کنول توڑ رہی ہو اور سیاہ کھتری اور چپٹی ہو تو بے اختیار یہی جی چاہے گا کہ چڑیل کو پانی میں ڈبو دو۔"

خیر تو اس کے جنگل کے سادھو کی لڑکی بھی حسین ہوتی۔ اب یا تو وہ گھوڑے پر سے گر پڑتا اور وہ لڑکی اس کا سر زانو پر رکھ کر ہوش میں لاتی، یا پھر وہ پیاسا ہوتا اور کٹی میں جاتا، اور سادھو اپنی حسین منورا، آشا یا روپا جو کچھ بھی ہوتی اسے پکارتا، اور وہ بجلیاں گراتی آنچل کے شعبدے دکھاتی آتی اور لٹیا گلاس میں تازہ بکریوں کا دودھ دوہ کر لاتی۔ شرمانا اس کے لئے ضروری ہوتا اور اس کے جسم میں بجلی کوندانے کو اس کی پتلی انگلیاں شرطیہ طور پر چھو جاتیں۔ اور جب یہ معاملہ ہو تو انجام

معلوم ہی ہے۔"

عصمت کے ہاں موضوعات کی کمی نہیں۔ "کیوں رے کتے" اور "بن بلایا مہمان" ہندو مسلم مناقشات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ "ایک شوہر کی خاطر" اور "سفر میں" ریل کے ڈبوں سے متعلق طنزیہ خاکے ہیں۔ "بیمار" میں سل کے ایک قریب المرگ مریض اور اس کی نوجوان بیوی کا نفسیاتی موازنہ ہے "تل" میں ایک ادھیڑ عمر کے مصور اور اس کی ماڈل بھکارن رانی کے دو متضاد اور مخالف کردار پیش کئے گئے ہیں۔ جس میں "آرٹ" اور "جنس" کے تاثرات لاشعور کی لہروں پر متصادم اور "دست و گریباں" نظر آتے ہیں۔ "پنکچر" اور "بھول بھلیاں" محبت اور معاشری شادی سے متعلق ہیں۔ ان دو افسانوں میں عصمت چغتائی کی پیغامیت روایت شادی پر محبت کو اور رسمی ایجاب و قبول پر دلی رفاقت کو ترجیح دیتی نظر آتی ہے۔ "لحاف" میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک نوجوان اور شریف عورت ایک ہیجڑے خاوند کے پلے باندھ دیجائے تو وہ اپنی زندگی کس طرح گزارتی ہے۔ (یہ افسانہ پڑھ کر اکثر لوگ چونک پڑتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں؟)

"ساس" میں وہی ازلی، ابدی، دوامی ساس ہے جو ہندوستان کے ہر گھر میں موجود ہے۔ اور جس کا غصہ اور جس کی کھاؤں کھاؤں ہر زمانہ میں شب و روز گونجتی ہے۔ "دوزخی" شخصیت سے قطع نظر ایک دائم المریض ہستی کے کردار کا مطالعہ ہے اور اتنا سچا، اتنا جھوٹا، اتنا بے رحم اتنا نرم و نازک، اتنا پیارا، اتنا برا، اتنا خوبصورت اسکیچ اردو میں اور لکھا ہی نہیں گیا۔ لیکن موضوعات کی اس فراوانی کے باوجود کہنا پڑے گا کہ عصمت چغتائی کے افسانوی جوہر کا مربع ایک متوسط طبقے کا گھر ہے یہاں مزدور اور کسان نہیں بستے نہ ہی سیٹھ اور سر اور خان بہادر۔ اس میں مذہبیت بھی ہے اور گھٹا گھٹا ماحول بھی۔ پردہ بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔ شرم بھی ہے اور بیباکی بھی کالج کی لڑکیوں کی چہلیں ہیں اور برادر نسبتی، ساس، دلہن، نند، بھاوج کی آویزشیں اور سارا تضاد اور وہ ساری خوبصورتی اور بدصورتی (خوبصورتی کم اور بدصورتی زیادہ) جن سے ایک متوسط طبقے کا گھر بنتا ہے ان افسانوں میں موجود ہیں۔

یہ دنیا جھوٹی نہیں۔ آپ کے گھر کی دنیا ہے۔ ایک عورت کی دنیا۔ محیط میں سمندر کی سی وسعت ہو نہ ہو۔ سمندر کی سی پایابی ضرور موجود ہے۔ ان افسانوں کو مصنفہ نے ایک عورت کے سے حسن انتظام اور سلیقے سے سجایا ہے سیدھی سادھی زبان جو کم و بیش شمالی ہند کے ہر گھر میں سمجھی جاتی ہے چھوٹی چھوٹی نسوانی تشبیہیں اور محاورے اور استعارے شوخیاں اور چٹکیاں جو آپ ہی آپ اس نگارخانے میں خوبصورت گل بوٹے بناتی جاتی ہیں ہر چیز اپنی جگہ پر خوبصورت معلوم ہوتی ہے اور پھر افسانے کے کلی تاثر میں بھی معتدبہ اضافہ کرتی ہے۔ اس کی زینت کو دوبالا کرتی ہے۔ اس کی آب و تاب کو جلا دیتی ہے اس طرح کہ ہر افسانہ ایک ترشے ترشائے ہیرے کی طرح درخشندہ نظر آتا ہے۔

پہلے پہل جب عصمت کے افسانے اردو رسائل میں شائع ہوئے تو یار لوگوں نے کہا:۔

"اجی کوئی مرد لکھ رہا ہے ان افسانوں کو ہماری شریف بہو بیٹیاں کیا جانیں افسانے کیسے لکھے جاتے ہیں۔"

لیکن جب عصمت برابر افسانے لکھتی رہیں اور افسانے لکھنے پر مصر رہیں تو ارشاد ہوا:۔

"جی ہٹاو بھی۔ وہ کیا لکھیں گی بڑن کہیں کی۔ بس جب دیکھو جلی کٹی سناتی ہے۔ لاحول ولا قوۃ ایسی بھی کیا عریانی۔"

پھر وہ دور آیا۔ "ہاں اچھی ہیں۔ خواتین افسانہ نگاروں کی صف اول میں شمار کی جا سکتی ہیں (یہ اب اردو میں صف اول کی نئی بدعت پیدا ہوئی ہے۔ افسانہ نگاروں سے لے کر فاسفورس کے تیل تک ہر چیز ان دنوں صف اول میں شمار کی جاتی ہے۔ تولی جاتی ہے۔ بیچی جاتی ہے۔) عورتوں کی نفسیات کو خوب سمجھتی ہیں۔" (یہ عورتوں کی نفسیات بھی خوب رہی) وغیرہ وغیرہ۔

اور اب! اب یہ حال ہے کہ عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگاروں کو دورے پڑنے لگتے ہیں۔ شرمندہ ہو رہے ہیں۔ آپ ہی آپ خفیف ہوئے جا رہے ہیں۔ یہ دیباچہ بھی اسی خفت کو مٹانے کا ایک نتیجہ ہے۔

❀❀❀

عصمت کے افسانے گویا عورت کے دل کی طرح پر پیچ اور دشوار گزار نظر آتے ہیں۔ مجھے یہ افسانے اس جوہر سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں جو عورت میں ہے۔ اس کی روح میں ہے۔ اس کے دل میں ہے۔ اس کے ظاہر میں ہے' اس کے باطن میں ہے۔

(کرشن چندر)

عصمت کی شخصیت اردو ادب کے لئے باعث فخر ہے۔ انہوں نے بعض ایسی پرانی فصیلوں میں رخنے ڈال دیئے ہیں۔ کہ جب تک وہ کھڑی تھیں' کئی رستے آنکھوں سے اوجھل تھے اردو ادب میں جو امتیاز عصمت چغتائی کو حاصل ہے' اس کا منکر ہونا کج بینی اور بخل سے کم نہ ہو گا۔

(پطرس بخاری)

RHOTAS BOOKS
Ahmed Chambers 5 Temple Road Lahore

Rs. 45/=